جلد ۸۲، ماہ ذی الحجہ ۱۳۷۷ھ مطابق جولائی ۱۹۵۸ء، نمبر ۱

مضامین

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

شذرات

افسوس ہے کہ گذشتہ مہینہ ہماری جماعت کے ایک نامور رکن مولانا ابوظفر صاحب ندوی نے انتقال کیا، ان سے دار المصنفین کے گوناگوں تعلقات تھے، وہ ندوہ کے مشہور فاضل، نامور اہل القلم اور حضرت سید صاحب کے حقیقی بھتیجے تھے، دار المصنفین میں بھی کئی سال تک رہے تھے، انکی پوری زندگی علم و تعلیم کی خدمت اور تالیف و تصنیف میں گذری، وہ مختلف اوقات میں شانتی نکیتن بنگال، جامعہ کالج مدراس اور دوسری تعلیم گاہوں میں معلم رہے، ادھر عرصہ سے گجرات ورنیکلر سوسائٹی احمد آباد میں ریسرچ اسکالر تھے، اور گجرات کی تاریخ اور ادبیات پر تحقیقات کر رہے تھے۔ ان کا ذوق خالص علمی اور ہندوستان کی تاریخ ان کا خاص موضوع تھا، اس پر انھوں نے کئی کتابیں لکھیں، دو کتابیں تاریخ سندھ اور مختصر تاریخ ہند دار المصنفین سے شائع ہو چکی ہیں، ایک کتاب گجرات کی تمدنی تاریخ کا مسودہ موجود ہے جو انشاء اللہ آیندہ شائع ہوگی، ایک کتاب تاریخ گجرات ندوۃ المصنفین دہلی سے شائع ہو رہی ہے، ان کے علاوہ سفرنامہ برہما، برہمی بول چال اور بعض دوسری کتابیں انکی یادگار ہیں، ان مستقل تصانیف کے علاوہ ان کے مضامین معارف اور برہان وغیرہ علمی رسالوں میں وقتاً فوقتاً نکلتے رہتے تھے، مگر ان میں استقلال نہ تھا، اسلیے اپنی علمی قابلیت کے لحاظ سے وہ جس شہرت کے مستحق تھے وہ ان کو حاصل نہ ہو سکی، ان علمی کمالات کے ساتھ بڑے دیندار، نیک نفس اور سادہ مزاج تھے، جہاں رہتے تھے علمی کاموں کے ساتھ کچھ نہ کچھ دینی اور قومی و ملی کام بھی کرتے رہتے تھے، حضرت سید صاحب کے گھرانے میں وہ آخری علمی یادگار تھے، وفات کے وقت ستر سال کے قریب عمر رہی ہوگی، اللہ تعالیٰ اس خادم علم و دین کو اپنی رحمت و مغفرت سے سرفراز فرمائے۔

سید ہی صاحب کے متعلقین میں دوسرا حادثہ سید عبد الحکیم صاحب دسنوی کی وفات کا ہے، وہ رشتہ میں سید صاحب کے چچا ہوتے تھے، مگر دونوں میں حقیقی چچا بھتیجے جیسے تعلقات تھے، دونوں ایک دوسرے کو بہت مانتے تھے، مرحوم سید صاحب کی ہر ترقی اور ہر اعزاز پر بے انتہا مسرور ہوتے تھے، سید صاحب بھی اپنے تمام نجی حالات اور علمی و قومی مشاغل کی اطلاع برابر انکو دیتے رہتے تھے، اس لیے سید صاحب کے مکاتیب کا سب سے بڑا ذخیرہ ان ہی کے پاس تھا، دونوں میں سنہ ۱۹۰۴ء سے لیکر سید صاحب کی وفات ۱۹۵۳ء یعنی تقریباً نصف صدی تک خط و کتابت رہی، یہ سارے خطوط سید عبد الحکیم صاحب نے محفوظ رکھے اور سید صاحب کی وفات کے بعد دار المصنفین کے حوالہ کر دیے جو اس کا بڑا قیمتی سرمایہ ہیں،

سید عبد الحکیم صاحب کی تعلیم بہت معمولی تھی لیکن ذوق علمی رکھتے تھے، اور کتابوں کے مطالعہ سے انھوں نے اچھی خاصی استعداد بہم پہنچالی تھی، ان کا سب سے بڑا کارنامہ دیسنہ کا اردو کتب خانہ ہے، یہ کتبخانہ اس لحاظ سے ہندوستان میں بے مثل ہے کہ اس میں اردو کی اکثر مطبوعہ کتابیں اور پرانے اخبارات و رسائل کے مکمل فائل موجود ہیں جو دوسرے کتب خانوں میں مشکل سے مل سکتے ہیں، یہ کتب خانہ زیادہ تر سید عبد الحکیم صاحب کی کوشش کا نتیجہ ہے، انھوں نے اس کو اپنی زندگی کا مقصد بنا لیا تھا، اردو کے شائقین اور اسکے ریسرچ اسکالر دور دور سے اس کو دیکھنے اور اس سے فائدہ اٹھانے کے لیے جاتے ہیں، سید صاحب سے تعلق کی بنا پر مرحوم کو دار المصنفین سے بڑا گہرا تعلق تھا، اگرچہ وہ اس کے کوئی عہدہ دار یا رکن نہ تھے لیکن انکی ہوا خواہی میں سب سے بڑھ کر تھے، وفات کے وقت نوے سال کی عمر رہی ہوگی، اللہ تعالیٰ ان کو عالم آخرت کی بخششوں سے نوازے،

یہ سطور زیر تحریر تھیں کہ نواب اسمٰعیل خاں مرحوم کی وفات کی خبر ملی، مرحوم ایک بڑے باپ نواب اسحٰق خاں کے لڑکے اور ایک نامور دادا نواب مصطفٰے خاں شیفتہ کے پوتے اور خود بھی بہت سے اوصاف

متصف، قدیم تہذیب و شرافت کا نمونہ تھے، قومی و ملکی سیاست سے بھی انکو دلچسپی تھی، چنانچہ خلافت کی تحریک کے زمانہ سے وہ کانگریس کے ساتھ اور ہندوستان کی جنگ آزادی میں عملاً شریک رہے، مگر اس زمانہ میں بھی ان میں بڑی دینی و ملی حمیت تھی، غالباً اسی بناپر پاکستان کے قیام کی تحریک کے بعد مسلم لیگ میں شامل ہوگئے، وہ اس کے مقتدر رہنما اور فطرۃً نہایت سنجیدہ متین اور باوقار تھے، اسلیے ہر زمانہ میں انکی روش معتدل رہی اور وہ جس جماعت میں بھی رہے انکی حیثیت امتیازی رہی اور انکا خاص وزن و وقار رہا، گو وہ لیگ کے لیڈر تھے، مگر ہندوستان کی تقسیم کے بعد انھوں نے پاکستان کی راہ نہیں لی، بلکہ ہندوستان ہی میں رہ کر یہاں کے مسلمانوں کے درد دکھ میں شریک رہے، کچھ دنوں تک مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر بھی رہے تھے، ان کی موت سے ہماری قدیم تہذیب و شرافت کی ایک باوقار یادگار مٹ گئی، اللہ تعالیٰ اس خادم ملک و ملت کو اپنی رحمت و مغفرت سے نوازے۔

ہندستان کی سرزمین میں جو علماء و اصحاب کمال پیدا ہوئے ان میں بہت سے قدیم علما کے حالات عرب مصنفین کیا ہندوستانی مصنفین کی کتابوں میں بھی کم ملتے ہیں، اسلیے کہ یہ آخری دور کی لکھی ہوئی ہیں، ہندوستان کے علما کے حالات میں سب سے زیادہ جامع کتاب مولانا حکیم سید عبدالحئی مرحوم کی نزہۃ الخواطر ہے، یہ کتاب بہت مبسوط اور دس بارہ جلدوں میں ہے، مگر ابھی اسکی صرف دو جلدیں شائع ہوئی ہیں، پھر بھی اسکو ہر حیثیت سے مکمل نہیں کہا جاسکتا، اسلیے مولانا قاضی اطہر مبارک پوری نے "رجال السند والہند" کے نام سے ایک کتاب مرتب کی ہے، اس میں قدیم یعنی ساتویں صدی سے پہلے کے علما اور اصحاب کمال کے حالات جمع کرنیکی خصوصیت کے ساتھ کوشش کیگئی ہے جو عام طور سے کم ملتے ہیں، اس حیثیت سے اسکو نزہۃ الخواطر کا استدراک کہا جاسکتا ہے، فاضل مصنف نے بڑی محنت اور جستجو سے یہ کتاب لکھی ہے، اور سیکڑوں مخزنوں کو کھنگال کر معلومات کا یہ خزانہ جمع کیا ہے، اس کتاب کی اشاعت سے ہندوستان کے مسلمانوں کی علمی تاریخ اور عربی طبقات و تراجم میں ایک بیش قیمت کتاب کا اضافہ ہوا جس کے لیے فاضل مؤلف مبارکباد کے مستحق ہیں، اعلیٰ کاغذ اور خوبصورت ٹائپ میں چھپی ہے، ضخامت ۳۲۰ صفحات، قیمت دس روپے، دارالمصنفین اعظم گڈھ سے ملے گی۔

مقالات

"ذکر یارانِ زماں"

(مولفہ احمد علی رسا)

ازجناب محمد سخاوت مرزا صاحب بی اے، ایل ایل بی عثمانیہ

ذکر یارانِ زماں، مولوی احمد علی رسا لکھنوی کا ایک خاص تذکرہ ہے، جو ابتک پردۂ گمنامی میں تھا جس میں مشاہیر ہندوستان کے چشم دید حالات ہیں، اس لیے ہم یہاں اس کے متعلق اس کی نوعیت اور تفصیل درج کرتے ہیں :-

احمد علی رسا، نام کے دو شعراء لکھنؤ میں گزرے ہیں، ایک تو میر احمد علی رسا، تلمیذ اشک لکھنوی، دوسرے رسا احمد علی تلمیذ علی بخش بیمار، جن کے کلام کا کچھ انتخاب بھی مؤلف خمخانۂ جاوید نے دیا ہے، آخرالذکر رسا نے ایک تذکرہ الموسوم بہ "ذکر یارانِ زماں" بدوران ملازمت سرکاری، لکھا تھا، جو ۱۲۸۰ھ میں ختم ہوا، یہ تذکرہ نادر الوجود ہے، ہمارا خیال تھا کہ یہ احمد علی رسا کوئی اور شخص ہیں، اس لیے کہ رسا نے اس تذکرہ میں کسی اردو شاعر کا شاذ و نادر ہی ذکر کیا ہے، اور نہ اپنے اساتذہ علی بخش بیمار یا طالب علی خاں عیشی یا بیتاب ہی کا ذکر کیا ہے، البتہ اپنے ایک معاصر محمد صادق خاں اختر کا نام ضرور لیا ہے۔

مؤلف تذکرۂ شمع انجمن نے جو حالات بروایت نبیرۂ رسا (مولوی احمد حسین) درج کیے ہیں،

ان سے بھی منشی احمد علی رسا ایک فارسی گو شاعر معلوم ہوتے ہیں، جن کے چار فارسی دیوان اور ایک فارسی مثنوی نشتر غم کا ذکر ہے، اور فارسی کلام کا انتخاب بھی ہے، مگر جب ہم سنہ وفات اور فروغ تلمیذ رسا کا قطعۂ وفات اس میں بھی لکھا ہوا پاتے ہیں تو اس بات کی تصدیق ہوتی ہے کہ یہ رسا وہی اردو کے مشہور شاعر تلمیذ علی بخش بیمار ہی ہیں، تیسری چیز قابل غور یہ ہے کہ رسا نے اپنے وطن آبائی رام پور یا اپنے والد ماجد کا نام کہیں ظاہر نہیں کیا ہے، البتہ ایک جگہ اتنا اشارہ ہے کہ وہ کشمیری الاصل تھے، البتہ بعض رام پوری احباب کا ذکر کیا ہے، اگر مولف اپنی اردو شاعری اور اساتذہ و معاصرین شعرائے اردو کی علمی صحبتوں کا ذکر کر دیتے تو اس تذکرہ کی خاص اہمیت اور قدر و قیمت ہوتی. چنانچہ اس تذکرہ سے قبل فرخ آباد کے ایک مفتی و صوفی مولانا شاہ محمد ولی اللہ المتوفی (۱۲۴۹ھ) نے تیس سال قبل ایک تذکرہ لکھا تھا، جس میں علماء صوفیائے کرام کے علاوہ شعراء کے حالات بھی لکھے ہیں جس پر ایک مضمون ڈاکٹر مختار الدین صاحب کا اردو ادب علی گڈھ جولائی تا ستمبر ۱۹۵۴ء میں شائع ہوا ہے، اور جس میں رسا کے مرشد مولانا ظہور محمد، اور ایک عالم محمد اسلم بلگرامی کا بھی ذکر ہے، جن کا ذکر زیر بحث تذکرہ میں بھی موجود ہے،... رسا کو ان سے درسی علوم میں تلمذ بھی حاصل تھا۔

معلوم ہوتا ہے کہ ۱۲۸۰ھ تک رسا کو فارسی شاعری سے بیحد شغف رہا، اس تذکرہ میں رسا نے بہت سے اہل کمال علماء و فضلاء اور اولیائے معاصرین کے چشم دید حالات مختصر طور پر لکھے ہیں، ان کی اردو شاعری سے متعلق صرف اتنا ضرور پتہ چلتا ہے کہ ان کو اس میں بھی پوری استعداد اور مہارت تھی، چنانچہ اپنے ایک دوست میر نجان کی ایک اردو مثنوی ایک ہفتہ میں اصلاح کرکے واپس کر دی تھی۔

نتیجہ یہی نکلتا ہے کہ رسا، فارسی شاعری کو مرزا غالب کی طرح اپنا کمال سمجھتے تھے، دوسری چیز یہ ہے کہ در اصل رسا کو بوجہ کار و بار سرکاری، اردو کی طرف زیادہ توجہ نہیں رہی، رسا، غدر ۱۸۵۶ء

کے بعد وظیفہ پر علحدہ ہوئے، اور صوفیانہ مشرب کے لحاظ سے صوفیا، اور علماء میں عمر گزاری، اور ختم تالیف تذکرہ ۱۲۸۰ھ کے بعد ممکن ہے خاص لکھنؤ میں مستقل قیام کی وجہ سے اردو کی مشق بھی جاری رکھی ہو، اور شاید مکان میں چوری ہو جانے اور مال و اسباب لٹ جانے کی وجہ سے جس کا ذکر رسا نے کیا ہے، اپنے اصلی وطن رام پور چلے گئے ہوں اور وہاں شعراء و اہل کمال کی صحبت سے مستفید ہوئے ہوں، چنانچہ ان کے ایک صاحبزادے رامپور ہی میں ملازم تھے۔

بہر حال مؤلف شمع انجمن نے رسا کے حسب ذیل حالات درج کیے ہیں:

"رسا تخلص منشی احمد علی لکھنوی، جامع علوم و اخلاق گزیدہ بود، و در نظم و نثر فارسی فکرش رسا و سنجیدہ، مثنوی نشتر غم و چہار دیوان فارسی از دے یادگار، وید طولاش، در خوشنویسی سرآمدۂ روزگار و مشق سخن در ابتدا، از طالب علی خاں عیشی و محمد حیات بیتاب نمودہ، و مدتے در صحبت آغا نصیبی، و ملا اکبر شیرازی مستفید بودہ و برائے تکمیل این فن در عظیم آباد بخدمت ملا ابو قاسم سمنانی رسیدہ، و با ملا عبد الباقی مینائی و قاضی محمد عطا خاں اختر ہم طرح گردیدہ، پیش حکام فرنگ بعزت سرفراز و بعہدۂ تحصیلداری ممتاز، قبل ایام غدر ہندوستان از ملازمت سرکار انگریزی دل برکند و بر وظیفہ اعز الیہ آں سرکار قانع شدہ در وطن طرح اقامت افگند، بقیہ عمر بطاعت و عبادت مشغول ماند و در صحبت ارباب ذوق و وجد گذرانید، بتاریخ بستم ماہ شوال سنہ یکہزار دو صد و نود و دو ہجری از ہجرت در شہر لکھنؤ بہ رضوان شتافت تلمیذ رشیدش مولوی عبد العلی مدراسی متخلص بہ فروغ تاریخ وفاتش چنیں یافت ؎

احمد علی رسا کہ بدار البقا رسید | استاد غمگسار من پر ملال بود

تاریخ او نوشت فروغ از سر الم | احمد علی چہ صاحب فضل و کمال بود

۱ ۱۲۹۱ + ۱ = ۱۲۹۲ھ

این تذکرہ کرمی بینی بکتابت منشی احمد حسین دختر زادۂ رسائے مرحوم است۔"

رسا کے متعلق مؤلف خمخانۂ جاوید اس طرح رقم طراز ہیں:

رسا سر آمدۂ اذکیا میر احمد علی رسا ابن میر امام الدین رام پوری شاگرد رشید علی بخش بیمار، ان کے بزرگ رام پور میں ملتان سے آئے تھے، خوش فکر، رنگیں طبع، وارستہ مزاج شخص تھے، ۱۸۵۶ء میں ۵۶ سال کی عمر تھی، لیاقت علمی بہت اچھی تھی اور مدام مشغلۂ سخن رہتا تھا۔ مگر وارستگی مزاج کے باعث کلام کے فراہم کرنے کی نوبت نہ آئی، ورنہ کافی ذخیرہ چھوڑا تھا، کلام میں متانت اور پختگی بندش کے علاوہ استادانہ رنگ کی جھلک موجود ہے۔ مولانا عبد العلی مدراسی فروغ تخلص ان کے رشید شاگرد تھے، بالآخر ۱۲۹۲ھ میں بمقام لکھنؤ سفر آخرت کیا ؎

تاریخ او نوشت فروغ از سر الم — احمد علی چہ صاحب فضل و کمال بود

منشی محمد امیر اللہ تسلیم مرحوم نے بجواب عریضہ ۱۳۰۹ھ سال وفات تحریر فرمایا تھا، رام پور میں ان کے بیسیوں شاگرد تھے، صاحبزادے اوج تخلص کرتے ہیں۔ ؎

ہائے نیچی وہ شرمگیں آنکھیں — اور حیرت سے دیکھنا میرا

سنیں گے وہ مقرر میرے درد دل کا افسانہ — جگر تھامے ہوئے بیٹھے ہیں اہل انجمن اپنا

نہ انتظار کی تکلیف پوچھئے مجھ سے — گذر گئی جو گذرنی تھی جان مضطر پر

یارب یہ دل یہ جوش ہوس خاک میں ملے — کب تک ہر ایک بات کی ہم آرزو کریں

کھا ہوائے رسا اب اجابت — گر فرصت نہیں مجھکو دعا کی

ان آہ سوز عشق یہ آتش فشانیاں — اک آگ سی جہاں میں ہے گھر گھر لگی ہوئی

(خمخانہ ج ۳ ص ۳)

تذکرہ "ذکر یاران زماں" سے شیخ احمد علی رسا کے جو تفصیلی حالات معلوم ہوتے ہیں وہ یہ ہیں:

ان کا مولد لکھنؤ ہے، چنانچہ فرماتے ہیں:

"در لکھنؤ بخیال اینکہ اینجا از عالم غیب در عالم شہود آمدہ بودم قیام کردم"

تاریخ ولادت ان کے اس فقرہ سے مستنبط ہو سکتی ہے:

"در سنہ ہزار و دو صد و سی و شش ہجری کہ شانزدہ سالہ بودم روزے در اما طرغان سالان رفتم"

یعنی ۱۲۳۶ھ میں ان کی عمر سولہ سال کی تھی، اس لحاظ سے سنہ ولادت ۱۲۲۰ھ برآمد ہوتا ہے۔

ان کا نشو و نما اور تعلیم و تربیت لکھنؤ میں ہوئی، رسا نے اپنے والد کا نام ظاہر نہیں کیا ہے، لیکن اپنے خاص و قریبی اعزہ کے نام اور ان سے استفادہ کا ذکر کیا ہے، مثلاً مولوی شیخ احمد اللہ، مرید مولانا انوار الحق فرنگی محلی رسا کے ماموں تھے، ان ہی سے ابتدائی تعلیم و تربیت پائی تھی، اس وقت رسا کی عمر تیرہ سال سے کم تھی، چنانچہ فرماتے ہیں:

مولانا انوار الحق فرنگی محلی، داعی در خردگی ہمراہ خال خود شیخ احمد اللہ کہ مرید با مرا او بود بشرف ملازمت او مشرف شدہ بود چوں درآں زماں کم سیزدہ سالہ بود لیاقت مکالمہ نداشت الخ

رسا کے والد ماجد اور مرشد مولانا ظہور محمد بھی عالم فاضل شخص تھے، ان کو حدیث کی سند مولوی حسن علی ہاشمیؒ سے حاصل تھی، چنانچہ کہتے ہیں:

والد ماجدم، مرشدم قدس سرہ ہا سند علم حدیث از وحاصل کردہ"

ان کے دوسرے ماموں شیخ محمد محسن آصف الدولہ کی سوار فوج میں ملازم اور مرزا محمد معصوم ایرانی کے معاصر تھے، ان کے ماموں زاد بھائی علم اللہ عرف توکل شاہ اور اسد اللہ ابن احمد اللہ تھے، چچا کا نام اسد علی تھا، اور دوسرے چچا شیخ محمد بخش نامی تھے، روشن علی شاہ کرپی کی ان سے لکھنؤ میں ملاقات ہوئی تھی، نیز یہ بھی اشارہ کیا ہے کہ شاہ صاحب نے انکے والد کو ایک وظیفہ پڑھنے

کے لیے بلایا تھا۔

حسن علی ہاشمی محدث سے شرح وقایہ، حصن حصین، شمائل ترمذی اور تفسیر، اپنے ایک ہم سبق شیخ نصیر الحق ابن مولوی ظہور الحق کے ساتھ پڑھی، مولانا حیدر ابن ملا محمد مبین سے شرح ملا، ان کے صاحبزادہ مولوی غوث کے ساتھ اور مطول تفتازانی کے چند جزو، حافظ لطف رسول ابن فضل اللہ کیسا نحو پڑھی، جب مولانا حیدر حیدرآباد دکن چلے گئے تو یہ بھی لکھنؤ سے سیاحت کے لیے نکل کھڑے ہوئے، مولوی نور کریم صاحب تلمیذ مولانا عبد الحلیم فرنگی محلی سے علم نحو کے چند جزو پڑھے، حافظ محمد عبد اللہ تلمیذ محمد حسن شہید سہارنپوری سے قرآن پڑھا، اور قرأت سیکھی، حافظ غلام رسول، معاصر حافظ ضامن شاہ رامپوری سے سورہ یوسف تک قرآن حفظ کیا، مولانا محمد اسلم بلگرامی سے جو اپنے زمانہ میں عربی و فارسی میں اپنا مثل نہ رکھتے تھے، بعض فارسی کتابیں پڑھیں، ان کے داماد مولوی اوحد الدین بلگرامی سے رسا کو تلمذ تھا، چنانچہ لکھا ہے:

"راقم نیز بخدمت ایشان تلمذ داشت۔"

نیز ان کی عربی قابلیت کے متعلق اپنے ایک استاد ملا ابو القاسم سمنانی (جو بقول مؤلف شمع انجمن عظیم آباد میں مقیم تھے) کا قول نقل کیا ہے کہ ملا صاحب مرحوم امتحاناً شاہ عبد العزیز دہلوی و مولانا اسمٰعیل دہلوی کے علاوہ مولانا اوحد الدین کو بھی عربی زبان میں خط لکھا کرتے تھے، اس سے پتہ چلتا ہے کہ مولوی احمد علی رسا جن کو مؤلف خمخانۂ جاوید نے "سرآمد اذکیا" سے مخاطب کیا ہے، عربی فارسی کی کتب متداولہ فقہ و حدیث و صرف و نحو عربی، تفسیر جملہ علوم میں کامل دستگاہ رکھتے تھے، مؤلف شمع انجمن نے ان کے بعض اور اساتذہ کے نام بھی لکھے ہیں، یعنی رسا نے طالب علی خاں عیشی، آغا نصیبی، ملا اکبر شیرازی سے بھی اکتساب علم کیا تھا اور تکمیل علم کی خاطر عظیم آباد گئے، اور وہاں ملا ابو القاسم سمنانی کے سامنے زانوے ادب تہ کیا،

معاصرین فارسی شاعری میں مشہور شعراء، ملا عبد الباقی مینائی اور قاضی محمد صادق خاں اختر بنگالی کے ہم طرح تھے، قاضی صاحب مرحوم کے متعلق رسا نے لکھا ہے کہ ان کی ملاقات اور صحبت، بزمانہ تحصیلداری پرگنہ رسول آباد رہی،

رسا نے شاعری ابتدائے جوانی ہی سے شروع کر دی تھی، چنانچہ ملازمت کی تلاش کے ضمن میں لکھتے ہیں کہ میں اس وقت سولہ سال کا تھا، اتفاق سے خان ساماں کے احاطہ کی طرف گیا، وہاں ایک شاعر محمد ظفر اللہ خاں مرحوم سے ملاقات ہوئی جو فارسی کے بلند پایہ شاعر تھے، اپنی غزلوں کے مسودات ترتیب دے رہے تھے، مجھکو دیکھکر فرمایا کہ تم ذہین معلوم ہوتے ہو، تم کو بھی شاعری میں دخل ہے، میں نے اپنی بیاض نکالی، اور اپنا کلام سنایا، اسے سنکر بہت تعریف کی، اور فرمایا کاش میں اور تم دونوں ایک جگہ رہتے، تو کیا اچھا ہوتا، ان کے اصل الفاظ یہ ہیں:۔

روزے در احاطہ خان ساماں رفتم بایں خیال کہ اکثر بزرگان اینجا در دیگر بلا و ملازم انگریز اند شاید کہ صورت مدعا جلوہ کند ...... محمد ظفر اللہ خاں مرحوم شاعرے بود، خان مرحوم در نظم و نثر طبع عالی داشت، در آں وقت بعض غزلہائے خود را از پارہ ہائے پراگندہ بر بیاض نقل می فرمود، چوں مرا دید شناختہ پرسید کہ جودت طبع از فضل اکثر مردم ظاہر است آیا از صنائع دستی ہم چیزے بخاطر است عرض کردم کہ انچہ ہست حاضر است پس بیاض بدست خود آورده دو غزلہائے پریشاں را جمع کردہ پیش نمودم ہمیں کہ معاینہ نمود تحسینہا فرمود، پس از ان ناطقہ عالی ریخت کہ کاش من و تو یکجا بودے" الخ

غرض اس شعر و شاعری کی بدولت ظفر اللہ خاں سے ملاقات ہوگئی، اور ان کے ساتھ رہنے لگے،

اور ان ہی کے توسط سے وجہ معاش کا ذریعہ ہاتھ آگیا، چنانچہ لکھتے ہیں: خاں صاحب موصوف کے ایک منجھلے بھائی محمد فتح اللہ خاں تھے، جو اس وقت تعلقہ تالگرام ضلع فرخ آباد کی تحصیلداری پر بجائے اپنے چھوٹے بھائی محمد روح اللہ خاں کارگزار تھے، میں ان کے پاس ظفر اللہ خاں کے ساتھ چلا گیا، حاکمان بورڈ کا اضلاع میں دورہ ہورہا تھا، دونوں بھائی ان کے ہمراہ تھے، یہ لوگ دورہ کرتے ہوئے کانپور آئے، وہاں سے کالپی (جونپور) پہنچے اور چوراسی گنبد کے قریب قیام کیا، تحصیلداری اکبرپور، شاہ پور کے زمانہ میں بھی فتح اللہ خاں کے ساتھ رہا، بقول میرے اس شعر کے

خواہی کہ جدا کنی مرا از رہ   ہر جا کہ توئی رسا ست ہمراہ

پھر یہاں سے ان کے ہمراہ شہر باندہ چلا آیا، وہاں سے ان کا تبادلہ وارنگ حاکم بورڈ نے پرگنہ پیلانی پر کردیا، مسٹر ریڈ کلکٹر تھے، میں بلیعنہ نویسی پر مامور تھا، کلکٹر صاحب نے پرگنہ کی ہفتہ واری کیفیت کا نخشہ (روزنامچہ) طلب کیا، مگر عرایض نویس نے بلیعنہ غلط کردیا، میں نے کالپی کے عمدہ کاغذ پر نہایت صحت کے ساتھ لکھ کر پیش کیا، جس کو دیکھ کر حاکم بہت خوش ہوا، اور مجھکو ضلع باندا طلب کیا، اور نائب سررشتہ داری کی خدمت پر مامور کرلیا، اسکے بعد عظیم آباد اور مونگیر کی نائب سررشتہ داری کی خدمت انجام دی۔

۱۸۲۲ء میں قانون ہفتم نافذ تھا، میں کلکٹری ضلع سہارنپور میں کلکٹر صاحب کے ساتھ رہا، جب مسٹر ریڈ کا انتقال ہوگیا تو مسٹر گراہام اور ٹرنر یکے بعد دیگرے کلکٹر رہے۔ مگر مجھے کچھ دلبستگی نہ رہی، اس لیے مجھے ترک ملازمت اور وطن واپس جانے کا خیال ہوگیا، اس وقت فتح خاں صاحب میرے پرانے رفیق اعظم گڈھ میں کارگذار تھے، ان کو میں نے خط لکھا اور انھوں نے مجھے بلوالیا، اس وقت مولوی خیرات علی صاحب گورکھپور میں تھے، جو قانون ہفتم ۱۸۲۲ء کی تدوین میں مصروف تھے، یہاں سے ان کے پاس پہنچا جو راستہ میں ڈوہری گھاٹ کیمپ میں مقیم تھے،

مگر انکو کشمیریوں سے نفرت تھی، اس لیے کہ ان کو انعام احمد خاں کشمیری سے تکلیف پہنچی تھی، اس لیے وہ مجھ سے کھل کر نہ ملے، میں نے مولانا حسن علی محدث (ہاشمی) کجو خیرات علی کے استاد تھے، خط لکھا، انھوں نے خیرات علی سے سفارش کی، اور یہ الفاظ لکھے:

"عزیز ولی سعید ازلی شیخ احمد علی کہ او را بمنزلۂ خود دانم" الخ

غرض احمد علی رسا کی ملازمت کی ایک داستان ہے، مختصر یہ کہ رسا نے نائب سررشتہ دار کی پیشکاری سے تحصیلداری کی خدمت تک ترقی کی، وہ حسب ذیل انگریز کلکٹروں کے ماتحت رہے، مثلاً مسٹر ریڈ گورکھپور، کرافورڈ کلکٹر کانپور و مظفر نگر، مسٹر اوس، ولسن، مسٹر میور مددگار کلکٹر، مسٹر ایس براؤن کلکٹر، مسٹر کننگھم، رابرٹ منٹگمری، ٹامسن لفٹنٹ گورنر، مور لینڈ وغیرہ اور مختلف اوقات میں تحصیلداری پرگنہ شیوراج پور، سکندرہ، جاجمؤ، بٹھور، کانپور، الہ آباد پر مامور رہے، جس وقت رسا الہ آباد کی تحصیلداری پر گئے تو پانچ ہی ماہ کے بعد ۱۸۵۷ء کا غدر ہوگیا، وہ لکھتے ہیں، کلکٹر وقت نے بزبان اردو بتاریخ ۳۱ جولائی ۱۸۵۷ء تبادلہ کا حکم روانہ کیا کہ میرا تبادلہ پرگنہ سوارم سے کوای اور مبہ کیا جاتا ہے،" الخ

مولوی شاہ سلامت اللہ سے کانپور میں ملاقات ہوئی، میرے فرزند امجد علی نے قرأت سنائی، تو بہت مسرور ہوئے، اور میرے لڑکے حافظ امجد علی کی اپنی صاحبزادی سے شادی کردی، شیخ مظفر حسین ساکن بلگرام وکیل دیوانی سے میری ملاقات نواب گنج میں ہوئی تھی، سید صفدر علی تحصیلدار پرگنہ بلہور سے بھی ملا، اور اپنے دیوان سے ان کو اپنا یہ شعر سنایا ؎

مدہ از دست وضعِ خویش گر ہی عقل دین دار   کہ ایں معنی نماید بس غریب از شان دینداری

کانپور سے میرا تبادلہ الہ آباد ہوا، مگر میں اس سے خوش نہ تھا، اپنے مرشد مولانا سید ظہور محمد کو اس معاملہ میں خط لکھا تو حضرت نے تحریر فرمایا کہ الہ آباد چلے جاؤ اور اس طرح مجھکو مخاطب فرمایا:

"شفیق کرم مولوی شیخ احمد علی سلمہ اللہ" خیر سے الہ آباد چلا گیا۔

غرض رسا نے چالیس سال تک سرکاری فرائض بحسن و خوبی انجام دیے، اور ۱۸۵۹ء میں خود درخواست دیکر وظیفہ پر سبکدوشی حاصل کی، چنانچہ فرماتے ہیں:

بعد ازاں در پرگنہ ہنڈیا عرق ریزیہا کردم و خون جگر ہا کرخوردم بر ساکنان علاقہ ہنڈیا روشن و آشکار است، چوں عمر بانحطاط رسید وضعف گریباں گیر من گردید در ۱۸۵۹ء درخواست پنشن گزرانیدہ و بعد منظوری آں در لکھنؤ بخیال اینکہ آنجا از عالم غیب در عالم شہود آمدہ بودم قیام کردم .... الخ

گویا ۱۸۵۹ء میں رسا وظیفہ پر علحدہ ہوئے اور لکھنؤ ہی میں قیام پذیر رہے، مگر پنشن کے بعد بھی عزیز و اقارب نے چین سے بیٹھنے نہ دیا جس کا اظہار رسا نے ان درد بھرے الفاظ میں کیا ہے:

"عزیزاں را خور و خواب من براحت کہ عوض محنت و مشقت چہل سال نصیب شدہ بود خوش نیامد، حسد را کار فرمودہ بعض بد معاشاں خصوصاً عابد علی را ہموار کردہ در شبے متاع اندوختہ ام را بغارت دادند و مصداق الاقارب کالعقارب شدند کہ ذکر ہر یک بمحل خود بیاید انشاء اللہ تعالیٰ۔"

اس سے پتہ چلتا ہے کہ احمد علی رسا چالیس سال تک بسلسلۂ ملازمت مصروف رہے، مگر علمی مشاغل بھی جاری رہے، مؤلف شمع انجمن نے لکھا ہے کہ ان کے چار فارسی دیوان اور ایک مثنوی نشتر عشق فارسی میں ہے۔ البتہ ان کی اس تالیف سے اردو شاعری پر بھی خفیف سی روشنی پڑتی ہے، یعنی ایک جگہ انھوں نے لکھا ہے کہ میں نے میرن جان یحیائی الہ آبادی کی مثنوی پر اصلاح دی تھی، غالباً اس زمانہ یعنی ۱۸۵۷ء میں رسا الہ آباد میں تھے، اپنے خواجہ تاش شاہ غلام اعظم نبیرہ شاہ محمد اجمل افضلی کے متعلق لکھا ہے کہ

شعر اردو خوب میگویند، تیمناً بنام جد، تخلص افضل اختیار کردند۔"

نیز انھوں نے اپنے ایک استاد مولانا اوحد الدین بلگرامی، مؤلف نفایس اللغات کے مندرجہ بعض اردو الفاظ اور محاورات پر اعتراض کیا تھا، جس کو مولانا نے تسلیم کیا اور شاگرد کی اس گستاخی پر بجائے ملال کے ان کی تحقیق کا اعتراف اور تعریف کی،

ایک دوسری جگہ شاہ تراب علی قلندر کاکوری ابن کاظم علی قلندر کے متعلق لکھا ہے" زبان فارسی و اردو کے صاحب دیوان شاعر تھے" نیز فرماتے ہیں:

مثل والد بزرگوار خدمت ایشان، نیز ٹھیا فرمودہ اند کہ سرآئینہ میشوند، چنانچہ داعی بیشتر از زبان امیر "ڈھاڑی" سماعت کردہ است" الخ

انھوں نے اردو، فارسی کے کسی شاعر استاد کا ذکر نہیں کیا ہے۔ مولف شمع انجمن نے صرف فارسی شاعری کا ذکر کیا ہے، البتہ مولف خمخانۂ جاوید نے لکھا ہے کہ رسا اردو کے مشہور شاعر علی بخش بیمار رامپوری کے ارشد تلامذہ میں تھے۔ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ احمد علی رسا، علی بخش بیمار کے اس وقت شاگرد ہوئے جبکہ وہ بقول مؤلف "طور کلیم" عالم شباب میں مابعد ۱۲۳۶ھ لکھنؤ آکر مصحفی کے شاگرد ہوئے تھے، اور شہرت بھی حاصل کر لی تھی، یہ وہ زمانہ ہے جبکہ رسا فکر معاش میں سرگرداں تھے، چنانچہ لکھا ہے کہ

در سنہ ہزار و دو صد و شش ہجری کہ شانزدہ سالہ بودم در احاطۂ خان سامان رفتم الخ

اور یہاں ان کو ملازمت کے لیے مولوی ظفر اللہ خاں کا ایک وسیلہ ہاتھ آگیا تھا، جس کا ذکر ہم سطور بالا میں کر چکے ہیں،

نیز محمد علی خاں اثر رامپوری اپنے مضمون "علی بخش بیمار اور ان کا کلام" مندرجہ رسالہ اردو ادب علی گڈھ جولائی تا دسمبر ۱۹۵۲ء میں لکھا ہے کہ "بیمار کے رامپوری شاگردوں

میں ایک بلند پایہ شاعر میر احمد علی رسا رام پوری بھی تھے، جو استاد الاساتذہ تھے، جن کا انتقال ۱۷ محرم ۱۳۰۹ھ مطابق ۱۴ اگست ۱۸۹۱ء رامپور میں ہوا ہے"۔

رسا کے حسب ذیل تلامذہ تھے۔ "محمد عبد العزیز خاں بسمل، صاحبزادہ محمد محب علی خاں شوکت، نواب محمد معظم علی خان شمیم، صاحبزادہ علیم اللہ خاں رضا، منشی من بھاون لال خوش دل، احمد حسن خاں حسن، امداد حسین مظہر، شیخ مظہر حق مظہر، میر مجاور علی محب، سید افتخار الدین مغلوب، سید عبد الرزاق مائل، حسن علی خاں عاجز، خاں بہادر خاں عاشق، منشی امتیاز احمد خاں راز، سید عابد حسین اوج، بالخصوص راز کا رتبہ کافی بلند ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ کیا یہ شیخ احمد علی رسا رام پوری ثم لکھنوی وہی ہیں جن کا ذکر مولف شمع انجمن اور خمخانۂ جاوید نے کیا ہے؟ اور کیا ان کا آخری زمانہ پنشن کے بعد اپنے وطن مالوف میں گذرا ہے؟ اور وہیں انھوں نے وفات پائی؟ اور ان کا مدفن رام پور ہے یا لکھنؤ؟

ممکن ہے کہ رسا پنشن کے بعد مال و اسباب لٹ جانے سے پریشان ہو کر اپنے وطن مالوف چلے گئے ہوں، اور یہاں ان کو اردو شاعری کی مشق کا موقع ملا ہو، اور بوجہ علم و فضل اور جودت طبع اردو شاعری میں بھی کمال حاصل کیا، اور علم استادی بلند کیا ہو جس کے موجودہ رام پوری ادیب بھی معترف ہیں۔

مخطوط ذکر یاران زمان (فارسی) یہ کتبخانۂ آصفیہ کا واحد مخطوطہ ہے، جس کی تقطیع تقریبا ۶×۹ اور (۳۹۷) صفحات پر مشتمل ہے۔ مگر ناقص الآخر ہے۔ ذکر یاران زمان اس کا تاریخی نام ہے، جس کے اعداد (۱۲۸۰ھ) برآمد ہوتے ہیں، حمد و نعت، مناقب چہار یار کبار رضؓ کے بعد اپنے پیر و مرشد مولانا سید ظہور محمد کی منقبت بھی لکھی ہے۔

وجہ تالیف میں لکھتے ہیں کہ انھوں نے اس کو اپنے ایک دوست محمد فتح اللہ خاں تحصیلدار

کے ایما سے تالیف کیا تھا، جو حسب ذیل ابواب پر مشتمل ہے:

باب اول : درویشان عالی وقار : اس میں ۱۲۱ تراجم ہیں۔

باب دوم : ذکر دوستان جانی : ۲ "

باب سوم : ذکر دوستان زبانی : ۱ "

باب۔ بعض علما اور درویشان عالی وقار سے متعلق چشم دید حالات کے مختصر اقتباسات کا ترجمہ درج ذیل کیا جاتا ہے:۔

(۱) مولانا انوار الحق فرنگی محلی: "میں بچپن میں اپنے ماموں شیخ الحمد للہ کے ساتھ جنکو حضرت موصوف سے بیعت تھی، حضرت کی خدمت میں جایا کرتا تھا، میری عمر ۱۳ سال سے کم ہوگی، مگر ان کی عالمانہ و عارفانہ گفتگو غور سے سنتا تھا۔ (۲) نور الحق (۳) شاہ کفایت اللہ خیرآبادی (۴) شاہ نجابت علی مجذوب (۵) مولانا مراد اللہ (نوٹ: مراد اللہ ابن مولوی نعمت اللہ عالم متبحر تھے، وفات ۱۲۸۰ھ) (علمائے فرنگی محل مطبوعہ) (۶) میر باقی مجذوب لکھنوی، (۷) شاہ بدر علی (۸) سید شاہ عالم علی (۹) مولوی امام بخش (۱۰) سید عبد الحفیظ (۱۱) سید احمد مجاہد بریلوی (۱۲) مولوی الحمد للہ مرید انوار الحق، میرے خال یعنی ماموں تھے، جاہ و منزلت سے متنفر تھا، ایک مرتبہ نواب سعادت علی خاں نے مولوی سدن سے کہا کہ کسی عالم باعمل کو بلواؤ تو سدن نے الحمد للہ کا نام لیا، اور کہا "الحمد للہ طالب جاہ دنیا نگردید"

مولوی الحمد للہ نے ایک مثنوی کے چند جزو بطرز مولانا روم لکھی تھی، مگر ان کے فرزند اسد علی نے اس کو ضائع کر دیا (۱۳) مولانا عبد الرحمن صوفی مؤلف رسالہ کاسر الاسنان دربیان معنی لا الہ الا اللہ، جس کا ترجمہ مولوی نور اللہ نے کلمۃ الحق کے نام سے کیا تھا، اسمٰعیل دہلوی نے کہا کہ "تصوف در عہد عبد الرحمن اول جوان بود و در عہد ایں عبد الرحمن پیر گشت"۔ مگر شرح

کلمۂ طیبہ حقیقت میں بڑی بلیغ ہے، سوائے منتہی کے کوئی سمجھ نہیں سکتا۔ مولانا مسجد پنڈاین میں مقیم تھے، بعض اشرار نے بندوق اور تلوار سے حملہ کیا، مگر آپ پر اس کا کچھ اثر نہ ہوا، خود ذلیل و خوار ہوئے (۱۴) فتح علی شاہ، مولانا عبد الرحمن کے خلیفہ تھے، (۱۵) شاہ رحمن بخش فتح علی شاہ کے فرزند تھے (۱۶) برہان الحق (۱۷) مولانا ظہور علی عرف غوثن ولد محمد مبین میرے خاص دوست تھے (۱۸) مولوی محمد یوسف (۱۹) مولانا تراب علی (۲۰) مولوی لطف اللہ، علم کلام و تفسیر میں بے نظیر تھے، رسالہ قبقاب و تفسیر مظہر العجائب باصرہ افروز راقم نیز گردیدہ است در حقیقت کارے کردہ کہ دریا را بکوزہ آوردہ" ۲۵ جز میں سورۂ فاتحہ کی تفسیر ہے، ان پر لوگوں کا حسد کرنا بیجا ہے (۲۱) حافظ عنایت اللہ رام پوری (۲۲) حاجی وارث علی سے لکھنؤ میں تین مرتبہ ملاقات ہوئی، سر و پا برہنہ اور احرام باندھے تھے، نماز نہیں پڑھتے تھے، لوگوں نے مجھ سے کہا کہ "ترک نماز" پر بحث کرو، مگر میں نے اس کو مناسب نہ سمجھا کہ ملال ہوگا، ان کے مریدین و معتقدین بہت ہیں (۲۳) شاہ عبد اللطیف (۲۴) شاہ دیدار حسن خلف سعدی میاں بلگرامی (غلام نصیر الدین سعدی بلگرامی، مرشد افضل العلماء ارتضا علی خاں خوشنود گوپاموی ثم مدراسی) (۲۵) مولانا حسن علی کبیر (۲۶) حسن علی ہاشمی (صغیر) جامع علوم ظاہری و باطنی تھے، ذو الفقار دنواب باندہ کے پاس مقیم تھے، ان کے شاگرد مولوی خرم علی بے نظیر عالم تھے، سید ابو سعید چشتی کے مرید تھے، میرے والد ماجد اور مرشد نے ان سے علم حدیث کی سند لی تھی، شرع کے معاملہ میں شمشیر برہنہ تھے، میں نے شرح وقایہ، حصن حصین و شمائل ترمذی، شیخ نصیر الحق ابن مولانا ظہور الحق کے ساتھ پڑھی تھی اور علم تفسیر کے نکات سے بھی بہرہ ور ہوا تھا، ان کے وعظ میں بھی شریک رہا کرتا تھا۔ (۲۷) مولانا حسین احمد (۲۸) مولانا عبد الوالی فرنگی محلی: عالم بے بدل صوفی، حافظ (نبیرہ مولانا انوار الحق)

اس وقت تقریباً سو سال کی عمر ہے، مگر اب بھی احکام شریعت و طریقت کی بجا آوری کا وہی حال ہے۔

۲۹۔ مولانا عبد الحلیم فرنگی محلی - از علمائے اجل فرنگی محل ست (نبیرہ بحر العلوم) تلمیذ مولانا نور الحق، جوانی سے بڑھاپے تک سوائے درس و تدریس کے کچھ کام نہ تھا، میں بچپن میں انکی خدمت میں حاضر رہا کرتا تھا، اور ان کے ایک شاگرد مولوی نور کریم سے میں نے علم نحو کے چند جزو پڑھے تھے۔

۳۰۔ مولانا محمد حیدر: ابن مولوی محمد مبین، بڑے فاضل اور قاری خوش الحان تھے، چھوٹوں کو مثل فرزند سمجھتے تھے، راقم اور مولوی ظہور علی عرف غوثن سے برادرانہ تعلقات گویا دستار بدل بھائی تھے، صبح سے رات گئے تک ایک جگہ رہا کرتے تھے، میں نے مولوی غوثن کے ساتھ ان سے شرح ملا اور حافظ لطف رسول ابن فضل اللہ ساکن نوتنی کے ساتھ مطول کے چند جزو پڑھے تھے، جب حضرت مولانا حیدر دکن چلے گئے تو میں نے بھی لکھنؤ کو خیرباد کہا اور سیاحت کے لیے چل کھڑا ہوا۔[1]

۳۱۔ مولانا ظہور اللہ: سر آمد علمائے فرنگی محل، علم فقہ میں بے بدل تھے، دوسرے فقہا تو دو روز کتابیں دیکھکر فتوے پر دستخط کرتے تھے، مگر مولانا ایک ہی نظر ڈالکر دستخط کر دیتے۔

۳۲۔ مولوی نعمت اللہ (۳۳) مولوی محمد جمال فرنگی محلی۔ میں بچہ تھا اور وہ جوان تھے، دور سے سلام کر لیا کرتا تھا، محرم کی ساتویں آٹھویں کو فرنگی محل کی گلی سے ایک امیر کے

---

[1] مولوی حیدر حج سے بمبئی واپس آئے، تو نواب شمس الامرا سے وہاں ملاقات ہو گئی، اور نواب صاحب حیدرآباد لے آئے، بڑی عزت و قدر ہوئی، ایک ہزار ماہانہ کی جاگیر ملی، ایک عقد بھی حیدرآباد میں کیا، اور حیدرآباد کے مشہور خاندان کی بنا پر مولوی قمر الدین اورنگ آبادی سے ازدواجی تعلقات بھی قائم ہو گئے، مولوی نور الحسنین حیدرآبادی آپ کے صاحبزادے تھے۔ (علمائے فرنگی محل، مطبوعہ)

علم نکلا کرتے تھے، ایک مرتبہ اشرار نے دروازہ پر بزرگوں پر تبرا کہا، یہ سنکر مولانا تنہا برہنہ تلوار ہاتھ میں لے کر نکلے، سینکڑوں کا مقابلہ کیا اور اشرار فرار ہوگئے۔

(۳۴) محمد اشرف ابن قاضی نعمت اللہ لاہوری خوشنویس (۳۵) حافظ عبد العزیز (۳۶) خواجہ حافظ امیر الدین کشمیری (۳۷) حافظ محمد محمود (۳۸) مولانا سبحان علی مرید مولانا فخر (۳۹) شاہ عبد الرزاق شاہجہان پوری (۴۰) سید شیر محمد مجذوب (۴۱) سید مہر علی شاہ مجذوب سبا، (۴۲) سید شاہ علی خلیفہ مولانا ضیاء الدین خلیفہ مولانا فخرؒ (۴۳) شاہ احسان علی سہارنپوری، (۴۴) حکیم محمد بخش (۴۵) مولانا الٰہی بخش کاندھلوی تلمیذ شاہ ولی اللہ محقق دہلوی (محدثؒ)

(۴۶) حکیم مغیث الدین سہارنپوری (۴۷) حافظ محمد عبد اللہ تلمیذ محمد حسن شہید سہارنپوری ہم صحبت سید احمد بریلوی و اسمٰعیل شہیدؒ، میں نے ان سے قرآن اور تجوید سیکھی ہے، "استاد من در علم قرآن است"۔ (۴۸) مولانا اسمٰعیل شہیدؒ (۴۹) محمد اسحٰق نبیرۂ شاہ عبد العزیز محدث دہلوی، میں مولانا اسحٰق نبیرۂ شاہ عبد العزیز اور شاہ غلام علی خلیفہ مرزا مظہر جان جاناں سے ملنے گیا، راستہ میں مولانا غلام علی کی وفات کی اطلاع ملی، مولانا اسحٰق سے بیعت کرنا چاہا، فرمایا کہ ابھی وقت نہیں آیا ہے، پہلا نمبر تمہارا ہوگا، مگر حضرت موصوف حرمین ہجرت کر گئے (۵۰) شاہ عبد اللہ گلیم پوش (۵۱) شاہ غلام رسول خلیفہ مراد اللہ نقشبندی کالا (۵۲) مولوی ابو الحسن نصر آبادی، خلیفہ مولانا مراد اللہ نقشبندی مجددی، علوم ظاہر و باطن میں کامل تھے، میں ان کی صحبت بابرکت سے مستفید ہوا ہوں (۵۳) سید فرخ علی (۵۴) حافظ وارث علی تلمیذ مولانا محمد مخدوم، سکونت ٹکسال مقام چوک لکھنؤ، بے مثل واعظ اور درویش تھے، روزانہ بعد فجر تفسیر بیضاوی اور مشکوٰۃ پڑھایا کرتے تھے، نیز مثنوی شریف اور پدماوت ملک محمد جائسی کا کچھ حصہ، میں نے ان سے بوستاں باب پنجم تک سید میر علی پسر دبیر الدولہ سید عبد اللطیف کے ساتھ پڑھی تھی (۵۵) شاہ نذر محمد۔

۵۶ سید سلطان احمد برادر خورد و مرشد خود سید شاہ ظہور محمد خلیفہ مولانا ابو سعید المعروف بہ خیرات علی ابو العلائی از سلسلہ سید محمد کالپویؒ) سلطان احمد کے صاحبزادہ مولوی فضل الدین احمد مؤلف حقیقت العرفان،

(۵۷) سید کاظم علی (۵۸) سید حسین احمد (۵۹) سید ریاض مصطفےٰ (۶۰) شاہ مجیب اللہ الہ آبادی (۶۱) محمد شکر اللہ نبیرۂ شاہ محب اللہ (۶۲) حکیم حاجی سید فخر الدین احمد الہ آبادی (۶۳) سید شاہ عبد القادر ابن دلربا حسین الہ آبادی، (۶۴) مولوی کرامت علی جونپوری، (۶۵) شاہ محمدی ملتانی (۶۶) شاہ علی اکبر ابن شاہ علی مطہر بن شاہ باسط علی قلندر،

(۶۷) مرزا محمد معصوم ولایت زا۔ آصف الدولہ کے سواروں میں ملازم تھے، میرے ماموں شیخ محمد محسن بھی سواروں میں مامور تھے، باہم خلوص و محبت تھی، جوانی میں شیعہ مذہب تھا، پھر توبہ کی کسی کے مرید ہوئے، زیارت رسول اکرم سے مشرف ہوئے (۶۸) مولوی سید خیرات علی (۶۹) چراغ علی شاہ (۷۰) بخش اللہ شاہ (۷۱) شاہ سلامت اللہ بدایونی ثم لکھنوی، (۷۲) حافظ محمد بخش (۷۳) مولوی حفیظ الدین (۷۴) حافظ محمد سلیمان رامپوری، انکے بڑے بھائی حافظ محمد ادریس ہیں، پچاس سال سے زائد عرصہ سے لکھنؤ میں قیام ہے، عامل بے مثل ہیں (۷۵) حافظ الٰہی بخش دلال (۷۶) حافظ امین اللہ (۷۷) حافظ غلام رسول حافظ ضامن شاہ رامپور سے لکھنؤ آئے تو ان کا یہاں کوئی مدمقابل نہ تھا، مگر انھوں نے حافظ غلام رسول کی تعریف کی کہ ہندوستان میں ان کا نظیر نہیں، میں نے ان سے سورہ فاتحہ سے سورۂ یوسف تک حفظ کیا تھا، بڑے اچھے قاری بھی تھے۔ ۷۸۔ روشن علی شاہ آبی، ۷۹۔ مولوی وجہ الدین سہارنپور (۸۰) مولوی معین الدین کڑا الہ آبادی (۸۱) شاہ تراب علی قلندر، ابن شاہ کاظم علی قلندر کاکوروی مؤلف مطالب رشیدی، جو حسب ایماء رشید الدین خاں

ئیس کاکوروی لکھی ہے، دونوں زبانوں فارسی و اردو میں شعر کہتے ہیں، صاحب دیوان ہیں۔ (۸۲) توکل شاہ (۸۳) شاہ دلاور (۸۴) شاہ غلام رسول ثانی (۸۵) مفتی محمد اسد اللہ یحیائی افضلی الہ آبادی بنا بر شیخ محمد یحیٰی المعروف بہ شاہ محمد خوب اللہ (۸۶) شاہ غلام اعظم نبیرۂ شاہ محمد اجمل یحیائی افضلی الہ آبادی کے متعلق لکھا ہے کہ

ایں بزرگ شعر اردو خوش میگویند و تیمناً بر نام جد تخلص افضل اختیار کردند، ہمچنیں شاہ میرن جان کہ از اقربائے ایشانند ذوق اردو و پارسائی گوئی دارند، و مثنوی کہ بزبان اردو کہ پیش ازاں گفتہ بودند، بامید اصلاح پیش کردند چنانچہ اصلاح دادہ بہماں ہفتہ فرستادہ دادم الخ

نوٹ: شاہ میرنجان خلیفہ شیخ محمد افضل الہ آبادیؒ (حقیقت العرفان مطبوعہ حیدرآباد دکن ص ۱)

(۸۷) رجب علی شاہ مرید شیخ کرامت علی جونپوری و گلزار شاہ (۸۸) مولانا فضل الرحمٰن گنج مرادآبادی (۸۹) سعید اللہ شاہ (۹۰) حافظ محرم علی (۹۱) شمشیر علی شاہ مرید فتح علی شاہ مرید عبدالرحمٰن صوفی (۹۲) شاہ غلام مرتضیٰ (۹۳) آخوند نثار احمد (۹۴) نفقیہ الدین، (۹۵) حکیم علی حسین (۹۶) حافظ احمد علی خاں تلمیذ الٰہی بخش (۹۷) حافظ رحمت اللہ رامپوری (۹۸) شاہ عبداللہ رومی (۹۹) حافظ رحم اللہ ساکن دلیرنگر اٹاوہ، ۱۰۰- خواجہ عبدالواحد، (۱۰۱) شاہ نجات اللہ (۱۰۲) محمد تقی علی ۱۰۳ شاہ نبی بخش لکھنوی (۱۰۴) اسد علی شاہ، (۱۰۵) عبداللہ شاہ (۱۰۶) حافظ عبدالصمد، ۱۰۷ حافظ محمد احمد (۱۰۸) مولوی نظیر علی پسر شیخ مبارک علی (۱۰۹) شاہ خادم صفی (۱۱۰) امیراللہ شاہ (۱۱۱) آغا محمد سعید بغدادی (۱۱۲) تکیا شاہ مجذوب: ان کو میں نے ۱۲۳۶ھ میں بمقام عظیم آباد دیکھا تھا (۱۱۳) شاہ محمد ولی (۱۱۴) حافظ عبدالعزیز دہلوی (۱۱۵) حافظ عبدالعزیز خورد۔

(۱۱۶)۔ محمد اسلم بلگرامی :۔ "در علم عربی و پارسی یگانۂ وقت بود راقم نیز بعضے از کتب فارسی از ایشان خواندہ بود، گویند کہ تلامذہ را بر پشتہ ہائے کتاب زود ضرب مینماید لیکن مرا چنیں اتفاق نیفتادہ۔"

(۱۱۷)۔ مولانا اوحدالدین بلگرامی کے متعلق لکھتے ہیں:

"داماد محمد اسلم در علم عربی و فارسی از علمائے عہد ممتاز بودند، خصوصاً در تحریر عبارت عربی نظیر خود نمیداشتند، ملا ابوالقاسم سمنانی علمائے ہند را امتحاناً مکاتیب بعبارت عربی نوشت، ہمگناں جوابش نوشتند، بجز تحریر حضرت شاہ عبدالعزیز دہلوی و مولانا محمد اسمٰعیل و مولوی اوحدالدین مدح دیگرے نکرد۔ راقم نیز بخدمت ایشان تلمذ داشت، بر اکثر مسودات عبارت عربی اصلاح گرفتہ۔ نفائس اللغات از نتائج طبع ایشانست ظاہرا کتاب لغت است لکن عقلا دانند کہ در آں چہ کار کردہ اند گویا کرامت است کہ بظہور آمدہ لفظ اردوئے مستعمل ہند را عربی و فارسی مطابق محاورۂ اہل زبان تلاش کردن و بند آں اشعار شعرائے فارسی آوردن کار ایشان بود، طبیعت چناں انصاف پسند بود کہ در محاورۂ بعض الفاظ ہندی بطریق محقق بطور اعتراض حرف زدم، فرمودند کہ تحقیق شما صحیح است، بروقت تحریر نظر بتحقیق نداشتہ حسب محاورہ دہ نوشتہ دادم مثلاً لفظ "جھکنا" بمعنی افشاندن داکر اول است، مولانا بفتح نوشتہ اند و علی ہذا القیاس و دیگر بعض الفاظ راحب محاورۂ دہ نگاشتہ اند۔"

معلوم ہوتا ہے کہ بلگرامی صاحب کی کتاب نفائس اللغات بلا نظر ثانی کے طبع ہو گئی، جس پر حیدرآباد دکن کے ایک فاضل اور شاعر مولوی نصیر الدین نقش تلمیذ میر شمس الدین فیض نے بھی اعتراض کیا ہے۔ (رسالہ اردو جنوری ۱۹۵۸ء پاکستان)

(۱۱۹) خیرات علی شاہ صفی پوری (۱۲۰) شاہ دیدار حسن خلف سعدی میاں بلگرامی:
۱۲۳۶ھ میں میری دو مرتبہ ان سے ملاقات ہوئی، ایک مرتبہ بلگرام میں دوسری دفعہ فتح گڑھ
میں، بڑے سخی تھے، دوست و احباب کو جبراً بیش قیمت تحفے دیتے تھے۔

(۱۲۱) شاہ ضیاء اللہ - ص ۲۹۹/۳۰۲ معرا ہے۔ ص ۳۰۳: ذکر دوستان جانی (یعنی رسا مرحوم کے جانی دوست،
(۱۲۲) سید ناصر علی خاں - میران کا ساتھ چالیس سال سے ہے، ان کے متعلق ایک کتاب لکھی
جاسکتی ہے، اس مختصر میں گنجایش نہیں، کانپور میں مجھ سے اور مولوی کرامت علی سے شکر رنجی ہوگئی
تھی، ان کو ثالث بنایا گیا، مگر تحریری راضی نامہ طلب کیا، تو انھوں نے کہا کہ میری تقریر خود تحریر
ہے اور اٹھکر چلے گئے، ایک شخص نے میری غیبت کی تو اس کو بہت ڈانٹا، (۱۲۳) فتح خاں
خورجوی، (۱۲۴) عبد الحکیم امیٹھوی: ملا جیون کی اولاد میں اور شاہ کاظم قلندر کاکوروی
کے نواسہ ہوتے ہیں، لڑکپن سے کہولت تک میرے ہم سبق رہے، ۱۸۳۳ء میں کانپور آئے
تو میں نے ان کی ترقی ملازمت کی کوشش کی اور کامیاب رہا، (۱۲۵) منشی مظفر حسین بلگرامی:
بڑے مخلص اور امانتدار تھے، میں ٹھٹھور کا تحصیلدار اور ٹیکاپور میں رہتا تھا، ایک مکان خرید
لیا تھا، رات دن میرے پاس نشست رہتی تھی، جب میرا تبادلہ الہ آباد ہوگیا تو کرایہ میرے مکان
کا خود وصول کرتے تھے، اور غدر میں میرے مال و اسباب کی حفاظت کی، بعد غدر ان کا انتقال
ہوگیا، مگر ان کے ایک عزیز نے میرا سامان جوں کا توں واپس کردیا، (۱۲۶) مولوی ظہور علی
عرف غوثن خلف مولانا حیدرؒ: بارہ سال کی عمر سے ۵۰ سال کی عمر تک میران کا صبح سے شام تک
ساتھ رہتا، تو گویا میرے دستار بدل بھائی تھے۔

نوٹ:- مولوی ظہور علی بعد وفات مولانا حیدر ۱۲۵۶ھ میں حیدرآباد آئے، یہاں مولوی
نور الحسنین ان کے علاتی بھائی تھے، جن کی ایک لڑکی نور الرسول نبیرہ مولوی نور الاصفیا

اورنگ آبادی سے منسوب تھی، مولوی ظہور کے فرزند ظہور الحسن کو نجم العلما کا خطاب بھی تھا،
نواب نصیر جنگ کے داماد تھے، (تذکرۂ علمائے فرنگی محل ص ۳۶)

(۱۲۷) لالہ گوردین پسر لالہ موتی لال: مجھ سے بڑا خلوص تھا جن سے انتہائی بھائی چارہ
ان کی بے تعصبی پر دال ہے۔ لالہ جی نے میرے سو کام نکالے اور میں نے ان کے، مگر کبھی حساب کتاب
نہ ہوا، ایک مرتبہ کسی شخص نے کلکٹر سے دورہ کے موقعہ پر شکایت سربراہی کے متعلق بدظن کردیا
تھا، لالہ جی نے کلکٹر سے میری طرف سے خیالات صاف کیے، کلکٹر صاحب مجھ سے خوش ہوگئے،
(۱۲۸) دوستان زبانی: نذیر وغیرہ کا حال اور چند قصے بیان کیے ہیں، زمانہ کی شکایت
کی ہے، کہ میں لوگوں کے آڑے وقت کام آیا، مگر نتیجہ برعکس رہا، شکایتوں سے نہ بچا، گویا نیکی کر
دریا میں ڈال،

غرض احمد علی رسا کا یہ تذکرہ نایاب ہے اس سے بہت سے علمائے وقت کے حالات پر
روشنی پڑتی ہے، جو چشم دید ہیں، علمائے ہند کے تراجم کا یہ اچھا ماخذ ہے، بوجہ قلت وقت ایک
سرسری خاکہ پیش کردیا گیا ہے، اگر یہ وہی مشہور بلند پایہ شاعر اردو احمد علی رسا رامپوری ہیں
تو ان کی سوانح حیات پر کافی سے زاید روشنی پڑتی ہے، جو ابتک تاریکی میں تھے،

اسلامی فلسفہ اور دینیات کا اثر یورپی فلسفہ اور دینیات پر

مترجمہ سید مبارز الدین رفعت لکچرار گورنمنٹ کالج آف آرٹس اینڈ سائنس، گلبرگہ

(۳)

اللہ سے صفت کلام کے انتصاف سے کیا مراد ہے، یہ ایک بنیادی بحث بن گئی اور آخر کار حکومت کے زبردست ہاتھ کو اسی پر معتزلہ کو دبانے کا موقع مل گیا، معتزلہ کا کہنا تھا کہ اگر کلام اللہ کی صفت ہے تو لازمی طور پر اسے ازلی، قدیم اور تمام عالموں سے پہلے موجود ہونا چاہیے، ورنہ اگر اللہ نے زمان میں تکلم کیا تو اس سے اللہ کی ذات میں تغیر لازم آیا، اور اللہ وہ ہو گیا جو وہ اس سے پہلے نہ تھا، اس طرح کا استحالہ اللہ سے منسوب نہیں کیا جا سکتا، لہذا اگر کلام اللہ کی صفت ہے اور قرآن اس کلام کی دستاویز ہے تو اس مفروضے کی بنا پر قرآن کو بھی اللہ کا کلام ہونے کی حیثیت سے قدیم ہونا چاہیے لیکن یہ خلاف قیاس بات تھی، کیونکہ قرآن واضح طور پر عالم حادث کی چیز تھی، اسے نازل کیا گیا اور زمان و مکان میں اسے ضبط تحریر میں لایا گیا، چنانچہ اس کی بعض آیتیں واضح طور پر وقتی اور مقامی حوادث سے متعلق ہیں، اللہ کے صفات اس کے عین ذات ہیں اور اگرچہ خدا کی مخلوق سے خدا کے تعلقات کی بنا پر اس سے بعض صفات (صفات اضافی) بھی وابستہ ہو جاتے ہیں، جیسے خالقیت و قیومیت کے صفات، یہ صفات (یعنی صفات اضافی) صرف زمان میں پائے جاتے ہیں۔

خلیفہ مامون خود بھی معتزلی تھا، اس نے عقیدۂ خلق قرآن کو حکومت سے وفاداری کی شرط

قرار دیا تھا، بدقسمتی سے معتزلہ نے اپنے اقتدار کے زمانے میں عدم رواداری سے کام لیا، اور اس سلسلہ میں اہل سنت کا عقیدہ رکھنے والوں کو کافی تنگ کیا جس کا وبال آخر کار ان پر پڑا، اہلسنت یہ مانتے تھے کہ قرآن قدیم ہے، اور اس کے لفظی و ظاہری معنی ہی درست ہیں، اس کے ساتھ ساتھ وہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی جانب منسوب بہت سی حدیثوں کو بھی تسلیم کرتے تھے،

بہرحال چوتھی صدی ہجری میں یہ بات واضح ہو گئی کہ معتزلہ کے اٹھائے ہوئے بعض سوالات کے ساتھ رعایت ہونی چاہیے، لوگوں کے ذہن پراگندہ ہو چکے تھے، اور اس بات کی شدید ضرورت محسوس کی جا رہی تھی کہ مروجہ فلسفہ کی روشنی میں دینی عقائد کی پھر سے تفسیر کی جائے، اس کام کو دو عالموں نے اپنے ہاتھ میں لیا، اور یہی علماء مسلمانوں کے کلامی فلسفہ یعنی علم کلام کے بانی ہوئے ہیں، ان میں سے ایک ابوالحسن الاشعری بغدادی[1] (۹۳۲ء) اور دوسرے ابوالمنصور الماتریدی (متوفی ۹۴۴ء) ہیں، کلام ایک نظری علم ہے، جو دیگر مسائل کے ساتھ ساتھ الہیاتی مسائل سے بحث کرتا ہے، سینٹ تھامس نے "متکلمین" (Loquentes) کا ذکر کیا ہے، اس نے کلام کی یہ تعریف کی ہے کہ "علم کلام دین کی بنیادوں اور مختلف دینی حقائق کے لیے عقلی دلائل سے بحث کرتا ہے"۔ ابتدا میں لفظ "متکلمین" کا اطلاق کسی خاص دبستان خیال پر نہ ہوتا تھا، اور اہل سنت اور غیر اہل سنت کے لیے یکساں طور پر استعمال کیا جاتا تھا، لیکن آگے چل کر اس کا اطلاق خاص طور پر اسلام کے اہل سنت عقائد کی طرف سے مدافعت کرنے والے کے لیے ہونے لگا۔

---

[1] الاشعری نے اپنے نظام کی وضاحت میں جو رسالہ لکھا تھا، وہ اب پہلی بار جرمنی سے شائع ہو رہا ہے، جب تک یہ رسالہ شائع ہو کر عالموں کے ہاتھ میں نہ آئے اس وقت تک قطعیت کے ساتھ یہ کہنا ممکن نہیں کہ الاشعری کے دبستان کے اصول خود الاشعری کے خیالات کے ضامن ہیں۔

اندلس میں معتزلی عقائد عرصہ دراز تک فروغ نہ پا سکے، کیونکہ عوام کے ذہنوں میں زندیقیت خطرناک فاطمی خفیہ جماعت سے وابستہ تھی، اور یہ خفیہ جماعت تمام اسلامی اداروں کے لیے خطرہ بن گئی تھی، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ فلاسفہ خفیہ طور پر کام کرنے پر مجبور ہوئے، اندلس نے تین صاحب اثر عرب فلسفی پیدا کیے، یہ ابن مسرہ، ابن العربی اور ابن رشد ہیں، ان فلسفیوں نے فلسفہ اور دین میں امتزاج کا کام کیا، اس طرح کا امتزاج انھوں نے نو افلاطونی، نقلی امبیزوقلی (Psendo-Empedoclean) اور ارسطاطالیسی تحریروں سے حاصل کیا تھا، ان میں سے پہلے دو فلسفی درحقیقت صوفی تھے، انھوں نے زہد و ریاضت میں اپنے ان مشرقی ہم مذہبوں کی تقلید کی جنھوں نے زہد و ریاضت کے طریقے نصرانی راہبوں سے سیکھے تھے، اس کے ساتھ ہی انھوں نے تارک الدنیا زاہدوں کی ریاضتوں کے ساتھ وحدت الوجود کا نظری فلسفہ بھی ملا لیا،

ان میں پہلے صوفی محمد ابن عبد اللہ ابن مسرہ ۲۶۹ھ م ۸۸۳ء میں پیدا ہوئے، ان کے والد عبد اللہ قرطبہ کے رہنے والے اور معتزلی عقائد کے پرجوش طالب علم تھے، مگر اپنے عقائد کو انھوں نے پوشیدہ رکھا، ان کے انتقال کے وقت محمد ابھی کم سن ہی تھے، لیکن اتنی ہی عمر میں عبد اللہ نے ان کے دل میں عزلت نشینی کی زندگی اور نظری دینیات کا چسکا پیدا کر دیا تھا، چنانچہ تیس سال کی عمر کو پہنچنے سے پہلے ابن مسرہ قرطبہ کے اندرونی پہاڑی علاقے میں چلے گئے، اور حکومت کے خوف سے اسرار پسندی نے ان کی تعلیم کو ایسی گہرائی بخشی جو کسی اشاعت پذیر دین کو کبھی حاصل نہ ہو سکی، اسی اسرار پسندی کی وجہ سے بعد کی صدیوں کی فکر پر ابن مسرہ اور ان کے دبستان کا دائمی اثر رہا، اور آہستہ آہستہ یہ بات معلوم ہوگئی کہ ابن مسرہ کا گوشۂ عزلت ایک ایسا مرکز ہے جہاں سے خطرناک عقائد کی اشاعت ہو رہی ہے، چنانچہ الحاد کے الزام کے نتائج

کے خوف سے ابن مسرہ حج بیت اللہ کے لیے چلے گئے، اور عبد الرحمن ثالث جیسے عالم اور غیر متعصب حکمراں کے تخت نشین ہونے تک وہ عرب سے اندلس نہیں لوٹے، اس کے بعد جب لوٹے تو پھر ایک بار معلم کی حیثیت اختیار کر لی، اس وقت تو ان کی تعلیمات کی اسراری خصوصیت اور نمایاں ہوگئی، بیرونی دنیا کے نزدیک وہ ریاضتوں اور عبادتوں میں مشغول ایک زاہد مرتاض متقی تھے، ان کے مواعظ سننے والے معمولی لوگوں کو وہ ایک صوفی دکھائی دیتے تھے جن کے اقوال میں اہل سنت کے عقائد کے خلاف کوئی بات نظر نہ آتی تھی، لیکن اپنے پیروؤں کے اندرونی حلقے میں وہ علم اسرار حق کے ایسے معلم تھے جن کے الفاظ کے بطن میں کچھ اور معنی بھی پوشیدہ تھے، جنھیں چند منتخب لوگوں کے سوا دوسرا سمجھ نہ سکتا تھا، ابن مسرہ پہلے شخص ہیں جنھوں نے مغرب میں عام الفاظ کو مبہم اور غیر معروف معنی میں استعمال کیا، بعد کے بہت سے اسراری مصنفوں نے اس کی پیروی کی، ان کا یہ طریقہ اتنا کامیاب رہا کہ جب ۹۳۱ء میں انھوں نے وفات پائی تو ایک تشکیکی یا اسرار الٰہیات کے معلم کی بجائے انھیں مقدس زاہد مرتاض کی حیثیت سے یاد کیا جانے لگا،

ابن مسرہ کی لکھی ہوئی کوئی کتاب اب موجود نہیں، لیکن ایک اسپینی مستشرق عالم نے انکے نظام کے بنیادی خد و خال کا خاکہ تیار کرنے کے لیے سارا مسالہ اکھٹا کر دیا ہے[1]، اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ابن مسرہ اس فلسفہ کے بڑے پرجوش مبلغ تھے، جو یونانی فلسفی امبیزوقل (Empedocles) سے منسوب کیا گیا ہے، امبیزوقل کو مسلمان یونان کے سات بڑے فلسفیوں میں پہلا بڑا فلسفی مانتے تھے، امبیزوقل کے ساتھ یہ بھی افسانہ گھڑ لیا گیا تھا کہ اس نے حضرت داؤدؑ، حضرت سلیمانؑ اور حضرت لقمانؑ جیسے انبیاء و حکماء سے حکمت حاصل کی تھی، اس افسانے نے امبیزوقل کو اور بھی دینی تقدس کا جامہ پہنا دیا، اس طرح اسے انبیاء اور حکماء

[1] پروفیسر میجول اسین کی کتاب "ابن مسرہ اور ان کا دبستان" میڈرڈ ۱۹۱۴ء

کی صف میں لا کھڑا کیا گیا، حالانکہ وہ ان کے زمانوں کے بہت بعد پیدا ہوا تھا،

ابن مسرہ اور مشرقی نو افلاطونیت میں سب سے بڑا فرق مادۂ اولیٰ یا عنصر یعنی الهیولی الاولی کو خدا کی پہلی تخلیق ماننے کے سلسلہ میں دکھائی دیتا ہے، یہ عنصر روحانی تھا، اور اسے عرش خداوندی سے تعبیر کیا گیا تھا،

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان خیالات کو ابن مسرہ نے سب سے پہلے مغرب میں پھیلایا تھا، ان خیالات نے آنے والی صدیوں میں مغرب کے خیالات پر گہرا اثر ڈالا، مشہور یہودی فلاسفہ ابن جبرول المالقی (۱۰۲۰ء - ۱۰۵۰ء یا ۱۰۷۰ء)، یہوذا ہالیفی، ابن عزرا الغرناطی، یوسف بن صدیق القرطبی، عمویل ابن بتون اور شمطوب بن فلقیرا ان سب نے واضح طور پر نقلی امبیز دقلی عقائد کو اپنا لیا، لیکن یہ بات قطعیت کے ساتھ کہنا دشوار ہے کہ انھوں نے یہ عقائد و نظریات لازمی طور پر ابن مسرہ ہی سے حاصل کیے تھے،

قرون وسطیٰ میں یہودی فلسفیانہ فکر کا تفصیلی جائزہ اس سلسلہ کی کتاب[1] میں پیش کیا جا چکا ہے، تاہم یہاں یہودی فلسفہ پر عربوں کے احسان کا ذکر نا بے محل نہ ہوگا، اس سلسلہ میں یہاں اتنا کہنا کافی ہے کہ ارسطو کی تصانیف کا کبھی بھی کوئی عبرانی ترجمہ نہیں ہوا تھا، اور فارابی، ابن سینا اور ابن رشد نے ارسطو کا فلسفہ جس طرح نقل کیا تھا، اسی سے استفادے پر یہودی قانع رہے، اسی سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ یہودی کس درجہ عربی تہذیب سے متاثر تھے، عبرانی عالموں نے ارسطو کے عربی تراجم کو شک کی نظر سے دیکھا ہوگا (یورپی زبانوں میں جن مترجموں نے ارسطو کی کتابوں کا براہ راست یونانی سے ترجمہ کیا ہے، ان کے مقابلے میں عربی کے ابتدائی مترجموں پر آفریں کہنے کو جی چاہتا ہے) اور یہ طے کیا ہوگا کہ متذکرۂ بالا مصنفوں کے ملخصات اور شروح

[1] "ورثۂ اسرائیل" ص ۱۸۹ و ما بعد در مواقع،

سے کام لینا بہتر ہوگا،

معتزلہ نے یہودی مفکروں پر خاص طور سے گہرا اثر ڈالا ہے، بے شبہ بعض اوقات علم الکلام پر لکھی ہوئی کسی کتاب کے متن کو دیکھ کر یہ نہیں بتایا جا سکتا کہ اس کا مصنف یہودی ہے یا مسلمان، اس کے برعکس اہل سنت کے اشعری نظریۂ الٰہیہ نے یہودی اور نصرانی فکر کو متاثر نہیں کیا، کیونکہ یہ نظریہ طبعی قوانین اور اسباب و علل کے درمیانی رشتے کی وضاحت کی قطعی طور پر نفی کرتا ہے۔

سعدیہ بن یوسف الفیومی (۸۹۲ء - ۹۴۲ء) سے لیکر یوسف (۱۳۸۰ء - ۱۴۴۴ء) کے زمانے تک یہودی فلسفہ ان ہی مسائل اور مباحث سے متعلق رہا جو اسے عربوں سے ورثے میں ملا تھا، یہاں ان لوگوں کے ناموں کی فہرست پیش کرنے کی ضرورت نہیں جو اپنے زمانے کی فکر سے ہم آہنگ اور بعض صورتوں میں اس سے آگے تھے،[1] ان میں سب سے زیادہ اہم شخصیت موسیٰ بن میمون (۱۱۳۵ء - ۱۲۰۴ء) کی تھی، اس نے عرب متکلموں پر جو تحقیقی تنقید کی تھی، اس کو سینٹ تھامس اکیوناس نے کثرت سے استعمال کیا تھا، ابن میمون نے اللہ تعالیٰ کے وجود، وحدانیت اور عدم تجسیم کے ثبوت کے مواد کے لیے ارسطو سے رجوع کرنے میں ابن سینا کی پیروی کی ہے،

نصرانی علمائے متکلمین کے ایک طبقے میں ابن جبیرول کو غیر معمولی شہرت حاصل ہوئی جب بارہویں صدی کے نصف اول میں اوندت (Aven death) اور ڈومی نک گندی سالوس نے اس کی کتاب "منبع حیات" (Fons vitae) کا عربی سے لاطینی میں ترجمہ کیا تو قریب قریب بلا استثنا، پورا فرانسسکانی دبستان اس کتاب سے متاثر ہو گیا،

[1] ملاحظہ ہو "ورثۂ اسرائیل" ص ۹۲ - ۲۰۲ اور خاص طور پر ص ۳۴۴ و ما بعد

ادھر دومی نی کن دبستان نے سینٹ تھامس اکیوناس کے زیر اثر اس کتاب پر سخت تخریبی تنقیدیں شروع کیں. گندی سالوس نے خود تین کتابیں لکھیں، پہلی کتاب 'وحدانیت' (De Unitate) میں اس نے بتایا کہ خدا کے سوا سب چیزیں مادے اور صورت سے بنی ہیں، اپنی دوسری کتاب "صدور العالم" (De Processions Mundi) اور تیسری کتاب "النفس" (De Anima) میں اس نے اندلس کے عربی دبستان کے وحدت الوجودی نظریات کی تبلیغ کی ہے. کتاب 'منبع حیات' ہر قسم کی نزاعوں سے اس درجہ پاک تھی کہ بہت سے نصرانی مصنفوں نے اس کے مصنف کو عرب جانا، ادھر گل لیوم (Guillume d' Auvergne) نے اسے نصرانی مصنف سمجھا، جو عربی فلسفہ سے پوری طرح واقف اور نظریہ "کلمۃ اللہ" (Verbun Dei) میں کافی درک رکھتا تھا، گل لیوم، ابن جبرول کے اس نظریے کا حامی نہیں کہ روحانی موجودات مادے سے بنے ہیں، اس پر بھی وہ ابن جبرول کی تعریف کرتے ہوئے اسے سب سے بہتر فلسفی قرار دیتا ہے۔ اس سے یہ اندازہ لگانا درست ہوگا کہ وہ ابن جبرول کی تمام تصانیف سے واقف نہ تھا، بلکہ اس کی چیدہ چیدہ تحریریں ہی اس کی نظر سے گزری تھیں،

اسکندر الہالیسی (Alexander of Hales) نے بھی ابن جبرول کے نظریۂ مادۂ اولی کو اختیار کیا ہے، اور فرشتوں کے بارے میں کہا ہے کہ وہ صورت اور مادہ سے مرکب ہیں، اسی اندلسی یہودی سے اس نے یہ خیال لیا کہ ہر فاعلی اور انفعالی تعلق علی الترتیب صورت اور مادے پر دلالت کرتا ہے.

ابن جبرول نے اپنی کتاب کو 'منبع حیات' کا عنوان اس لیے دیا تھا کہ یہ کتاب اس بات کی مدعی تھی کہ تمام مظاہر کی تہ میں جو اصول کار فرما ہے، اس کے معارف عالیہ اس کتاب

کے اندر پیش کیے گئے ہیں، یہ علم جاہل اور احمق سے پوشیدہ رکھا گیا ہے، اور صرف فلسفی پر ہی اسکا کشف کیا گیا ہے، جو اسرار الٰہیہ میں غور وفکر کرتا ہے، اس طرح کائنات کی تفسیر اشیاء کی ماہیت کے مطالعہ سے نہیں، بلکہ اصول کے علم سے ہوسکتی ہے جس نے انھیں وجود بخشا ہے، حکمت بازغہ سے بیکن واقف تھا، اس نے فلسفہ کے بارے میں کہا تھا: یہ علم ایک نور قدسی کی ضیا پاشی سے وجود میں آتا ہے۔

مشائی تحریک (ارسطاطالیسی فکر) کے مطالعے کے احیا نے اس مخالفت کو تیز تر کر دیا تھا، جو نصرانی علمائے کلام کی طرف سے ہو رہی تھی، اور جو لوگ ان نظریات کی حمایت کرتے تھے انھیں نصرانی کلیسا کے آباء کی سند کا لباس پہنانے پر مجبور ہونا پڑا۔ سینٹ تھامس کو یہ ثابت کرنے کے لیے بڑی محنت کرنی پڑی کہ سینٹ آگسٹائن نے صراحت کے ساتھ روحانی وجود سے مادہ منسوب نہیں کیا ہے اور ایک یا دو ممکنہ استثنا کے ساتھ اس نے ابن جبرول کے نظریات کی تشریح محض ان کی تردید کے لیے کی ہے۔ سینٹ تھامس کی کتاب 'جواہر مفارقہ' (de substantus separatis) اس کی بین مثال ہے، اس کتاب میں سینٹ تھامس نے دعویٰ کیا ہے کہ روحانی وجود مادے کے بنے ہوئے ہیں، یہ ثابت کرنا ممکن ہے، اس نے عالم کے لیے اللہ سے تدریجی صدور کے نظریہ کے رد اور اس کی جگہ اللہ کی فوری تخلیقی قوت کے نظریہ کی حمایت میں دلیلیں پیش کی ہیں،

ایک اور مصنف جس کی تصانیف نے مغرب کو بہت متاثر کیا ہے وہ الغزالی (ابو حامد بن محمد الطوسی الغزالی ۴۵۰ھ/۱۰۵۸ء ۔ ۵۰۵ھ/۱۱۰۹ء) ہیں، انھیں حجۃ الاسلام کا لقب عطا کیا گیا ہے۔ انھوں نے اپنی متنوع زندگی اپنے عہد کی نمایاں ذہنی اور دینی تحریکوں کے درمیان بسر کی، پہلے وہ فلسفی رہے، پھر متکلم ہوئے، اس کے بعد حدیث کی پیروی کرنے لگے،

پھر متشکک اور آخر میں صوفی ہوگئے، ان کا خلوص شک و شبہہ سے بالاتر تھا، اور وہ بڑے
مضبوط اخلاقی مطمح نظر کے حامل تھے، وہ اپنی نسل کے ان چند گنتی کے نفوس میں تھے جنھوں نے
ہمیشہ اپنے ہم مذہبوں میں تزکیۂ اخلاق کا ولولہ پیدا کیا ہے، اسلام میں ان کا درجہ کچھ ویسا ہی
ہے جیسا کہ نصرانیت میں سینٹ تھامس اکیوناس کو حاصل ہے، دینیاتی مسائل پر ان کی
تصانیف پڑھتے وقت تثلیث یا تجسیم مسیح کے مسائل کے سوا یہ مشکل ہی سے یاد رہتا ہے کہ
یہ ایک مسلمان مصنف کی تصانیف ہیں۔

غزالی ابتدائے شباب ہی میں الٰہیاتی اور فقہی مسائل کے مطالعہ میں مشغول تھے، اور
بیس سال کی عمر سے پہلے ہی ان کے دل میں مسلمہ عقائد کے بارے میں شبہات پیدا ہوگئے
اور وہ اپنے طور پر دینیاتی مسائل کی تحقیق میں مشغول ہوگئے، وہ نیشاپور کے مدرسے میں
معلم مقرر ہوئے، یہاں سے بغداد کے مدرسۂ نظامیہ آئے جہاں انھوں نے علم فقہ کے
ماہر خصوصی کی حیثیت سے ملازمت اختیار کی، یہاں عقل و ایمان کی کئی سالہ کش مکش نے
ان کے اعصاب کو پراگندہ کر دیا، وہ دارالخلافہ کو چھوڑ کر عزلت و سکون کے کسی گوشے
کی تلاش میں نکل پڑے، جب ان کی قوت فکر منظم و بحال ہوئی تو وہ پھر ان چار طریقوں
کے مطالعہ میں مشغول ہوگئے جو حقیقت تک پہنچنے کے مدعی تھے۔ (۱) مذاہب علم کلام،
(۲) مذاہب تعلیمیہ، یہ لوگ معلم معصوم پر عقیدہ رکھتے تھے (۳) مذاہب فلاسفہ ارسطاطالیس
اور (۴) صوفیا کے خیالات، جن کا عقیدہ تھا کہ صوفیانہ طریقے سے خدا کا ادراک حالت جذب
میں ہو سکتا ہے۔ غزالی کا روحانی سفر ایک دلچسپ داستان اور پوری تفصیلات کے
ساتھ پڑھنے کے لائق ہے، ہمارے مقصد کے لیے اس کی سب سے بڑی اہمیت یہ ہے کہ غزالی
نئے سرے سے فلسفہ اور دینیات کے مختلف نظاموں کے مطالعہ میں مشغول ہوگئے اور

اس کے نتائج کو ایسی کتابوں میں پیش کیا جن کا لاطینی میں ترجمہ کیا گیا، منطق، طبعیات اور
مابعد الطبعیاتی مسائل پر ان کی تصانیف مغرب میں بارہویں صدی میں طلیطلہ کے ترجموں
کے ذریعہ عام ہوئیں لیکن جہاں تک مابعد الطبعیات کا تعلق ہے، غزالی کا اثر ابن جبیرول
کے اثر کی برابری نہ کر سکا، کیونکہ ابن جبیرول کا اثر اندلس کی فکر پر چھایا ہوا تھا، اور اس وقت
تک لاطینی دنیا پر چھایا رہا جب تک کہ ابن رشد اور سینٹ تھامس نے اسے پیچھے نہ دھکیل دیا،
یہاں ریمونڈ لل (Raymumd Lull) اور ریمونڈ مارٹن (R. Martin)
نامی اسپینی فلسفیوں کا ذکر ضروری ہے، ریمونڈ لل کے فلسفہ میں جو اختلاف رائے پیدا ہوگیا ہے
وہ اس نکتہ کو بہت اچھی طرح واضح کرتا ہے جس کی طرف اس مضمون کی ابتدا میں اشارہ کیا گیا ہے
اسپینی مستشرقوں کا دعویٰ ہے کہ انھوں نے لل کی تصانیف میں بہت سے عربی اثرات کی
مثالوں کا سراغ لگا لیا ہے، ادھر فرانسیسی کلامیوں کا دعویٰ ہے کہ لل کے نظام فلسفہ کی جڑیں
اگسٹائینیت (Augustianism) اور کلیسا کی قدیم روایات سے پیوستہ ہیں، جہاں
اختلاف خیال بہت اونچا ہو جائے وہاں اصل میں فہم عامہ کا سوال پیدا ہو جاتا ہے، غالباً
بہت سے لوگ ان حقائق سے اتفاق کریں گے، جو اس مضمون کے اختتام پر نتیجے کے طور
پر اخذ کیے گئے ہیں، قدیم کلاسیکی روایت نصرانی یورپ میں ناپید یا مبہم ہو چکی تھی، جو اسلام
ہی کی سرپرستی میں دوبارہ لوٹ کر آئی اور اس کی وجہ سے بڑے جوش کے ساتھ عربی تحریروں
اور ارسطو اور آبائے کلیسا کی تصانیف کا مطالعہ شروع ہوا، نصرانی متکلموں نے ایسے لوگوں
کا سہارا لیا ہے، جنھوں نے بحیثیت مجموعی قدما کے رنگ کی ایمان داری کے ساتھ ترجمانی
کی ہے، ایسی صورت میں ان پر عرب زدگی کا الزام لگانا درست نہ ہوگا، عرب نشاۃ ثانیہ
کے دنوں میں جو نصرانی بقید حیات تھے، وہ عربوں سے استفادہ میں کبھی جھوٹی شرم محسوس

نہ کرتے تھے، اور حق تو یہ ہے کہ خود عرب بھی اپنی ذہنی برتری پر جائز حد سے زیادہ فخر بھی نہ کرتے تھے، ابن طملوس الشقری نے ۱۲۲۳ء میں وفات پائی ہے، اور وہ لل کا تقریباً ہم عصر ہے، اس نے کسی جھوٹے فخر کے ساتھ نہیں لکھا کہ "علم ہندسہ" ہیئت اور موسیقی میں متقدمین علمائے اسلام سے کہیں آگے بڑھ گئے ہیں، اگرچہ آجکل زیادہ وثوق کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ لوگوں کو متقدمین کے مقابلے میں زیادہ معلومات حاصل ہیں، تاہم یہ بات بھی یاد رکھنی چاہیے کہ متقدمین کی بہت سی تصانیف اب ناپید ہو گئی ہیں،" ابن طملوس نے جس عالمانہ وقت نظر کے ساتھ یہ بات کہی ہے، عصری علمی تحقیقات اس کی تائید اور[1] اس کے پیش رو عالموں کے کارناموں کی عظمت کم کرنے کی بجائے اس میں اضافہ ہی کرتی ہے، اس کا یہ دعویٰ کہ مسلمان مفکروں نے مابعد الطبعیاتی مسائل کے سلسلہ میں جیسی کامیابی حاصل کی ہے، علوم واقعیہ میں بھی انھوں نے ویسی ہی کامیابی حاصل کی ہے، کچھ زیادہ وقیع نہیں، ہم دیکھ چکے ہیں کہ ارسطالیت پر عربی لباس میں کیا بیت چکی ہے،

فلسفیانہ فکر کی حامل ایسی قابل لحاظ جماعت کے فقدان نے جس پر عربی ہونے کا لیبل لگایا جا سکے، لل کے خیالات کے ماخذ کو الجھا دیا ہے، لیکن اس کے باوجود بھی ذرا غور کیجیے کہ لل علوم مشرقیہ کے مطالعہ کے ایک دبستان کا بانی ہوا ہے، وہ عربی بولتا اور لکھتا تھا، اس کی زندگی کا سب سے بڑا مقصد ذہنی حیثیت سے نصرانیت کو مسلمانوں پر مسلط کرنا تھا، کہتے ہیں کہ اس نے تونس کے عربوں میں تبلیغ کرتے ہوئے شہادت پائی تھی، جو شخص بھی ان باتوں پر غور کرے گا اسے یہ محسوس ہو گا کہ اگر لل کی زندگی سے براہ راست عربی اثرات کو خارج کر دیا جائے تو اس کی غیر معمولی دلبستگیوں کے دائرے کو غیر واجبی طور پر محدود کر دیا جائے گا، اس نے ایسے عہد میں زندگی بسر کی ہے (۱۲۳۵ء - ۱۳۱۵ء) جب مغرب اپنے

[1] ملاحظہ ہو "ورثۂ اسلام" کے ابواب ۱۰، ۱۱ اور ۱۲۔

فلسفہ کی اصل کی طرف رجوع کرنے لگا تھا، مسلم فلسفیوں کے خیالات سے اس نے کتنا استفادہ کیا ہے، اسکا فیصلہ اس کی تصانیف کے گہرے مطالعے سے ہی ہو سکے گا، اس میں کوئی شبہہ نہیں کہ لل نے اپنی الٰہیاتی یا عالم محویت میں لکھی ہوئی تحریروں کے بعض حصوں میں عرب مصنفوں سے بہت کچھ استفادہ کیا ہے، اس نے 'خدا کے سو نام' کے عنوان سے جو رسالہ لکھا ہے، وہ آپ اپنے ماخذ کی غمازی کر رہا ہے، دوسری طرف وہ درویشی کے نظام "مرابط" کا بحالت جذب و جوش، بعض الفاظ کے سرور انگیز ذکر و تکرار کا تحسین کے ساتھ تذکرہ کرتا ہے، یہ قیاس زیادہ قرین صحت معلوم ہوتا ہے کہ لل کی زبان، عادات اور طریق زندگی اور اس عہد کی اسلامی دنیا میں جو مشابہتیں پائی جاتی ہیں، اس کا سبب لل کا مشاہدہ اور اپنے ہمعصر مسلمانوں کی دینی زندگی سے اس کی دلچسپی ہے۔ اس کے بجائے ایسی مشابہتوں کو ابتدائی صدیوں کے قدیم نصرانی راہبوں سے منسوب کرنا بعید از قیاس ہے۔

یورپ میں علوم مشرقیہ کی اولین درسگاہ ۱۲۵۰ء میں بمقام طلیطلہ نصرانی مبلغوں نے قائم کی تھی، اس درسگاہ میں مسلمانوں اور یہودیوں میں تبلیغی کام کے لیے مبلغین تیار کرنے کے لیے عربی، انجیلی اور ربانی عبرانی کی تعلیم دی جاتی تھی، اس درسگاہ نے جو سب سے بڑا عالم پیدا کیا وہ ریمونڈ مارٹن تھا، یہ سینٹ تھامس کا ہم عصر تھا، عربی مصنفوں سے جتنی واقفیت اس نے بہم پہنچائی تھی، اس میں عصر حاضر کے یورپی عالموں کے سوا کوئی اس کی برابری نہ کر سکا، وہ نہ صرف قرآن اور اسلامی روایات سے پوری طرح آشنا تھا، بلکہ اس نے مسلمان فلسفیوں میں فارابی سے لے کر ابن رشد تک کے حوالے دیے ہیں، اور ان کے نقاط نظر کے باہمی اختلافات پر ناقدانہ بحث کی ہے، اس نے اپنی دونوں کتابیں یعنی 'الرد علی الامم الغیر المسیحیۃ (Summa Contra Gentiles) اور 'مسلمانوں اور یہودیوں کے مذاہب کا

خنجر (Pugio Fidei adversus mauros et judaeos)

مبلغوں کی جماعت کے صدر کے احکام کی تعمیل میں لکھی تھیں۔

ریمونڈ مارٹن ہی نے غزالی کی کتاب 'تہافت الفلاسفہ' کی اہمیت کو پہچانا اور اس کا بڑا حصہ اپنی کتاب "مسلمانوں اور یہودیوں کے مذاہب کا خنجر" میں نقل کیا ہے، اصل میں یہ فلسفیوں اور مسلمان متکلموں کی ایک نزاع ہے، اس کے بعد غزالی نے "خلق من العدم" کے اثبات میں جو دلائل پیش کیے ہیں، اور اللہ کے علم میں جزئیات کے شمول کے جو ثبوت دیے ہیں، انھیں اور عقیدۂ بعث بعد الموت کو نصرانی مصنفوں نے اپنی بہت سی کلامی تصانیف میں استعمال کیا ہے، غزالی نے فلسفیوں کی تنقید پر جو کتاب 'تہافت الفلاسفہ' کے نام سے لکھی ہے، ریمونڈ نے اس کے عنوان کا ترجمہ لاطینی میں 'فلسفیوں کی تباہی (Ruina sen Praecijntium Philosophorum) کیا ہے۔

نصرانی عالموں کو غزالی کا عقلی اور دینی نظریہ اسی وقت سے بھاگیا جب سے ان کی تحریریں پڑھی جانے لگیں اور اب بھی احتیاط کے ساتھ ان کے مطالعے کی ضرورت باقی ہے، مارٹن کی کتاب 'مذاہب کا خنجر' اس لحاظ سے قابل قدر ہے کہ اس میں مشرقی ادب سے بڑے سلیقے کے ساتھ استفادہ کیا گیا ہے، جس طرح آجکل کے علماء عام قاریوں کے لیے لکھتے وقت اصل کتابوں کی عبارتیں نقل کرتے ہیں، اسی انداز پر مارٹن بھی عہد نامۂ قدیم کی عبرانی تلمود اور ابن میمون کی تصانیف کی عبارتیں اصل عبرانی ہی میں نقل کرتا ہے۔ غزالی اور رازی کی عبارتیں وہ لاطینی میں دیتا ہے، اور جس کتاب سے یہ عبارتیں نقل کرتا ہے اس کا عنوان بھی بتا دیتا ہے۔

غزالی کی تصانیف میں مقام عقل اور الہام اور دینی عقائد کی تطبیق پر ایک رسالہ

ملتا ہے،[1] سینٹ تھامس نے "الرد علی الامم" (Summa) کے نام سے جو کتاب لکھی ہے، اس میں اور امام غزالی کے متذکرہ رسالے کے دلائل اور نتائج میں بہت سی مشابہتیں پائی جاتی ہیں، ان مشابہتوں کی بس ایک ہی تاویل کی جاسکتی ہے کہ سینٹ تھامس کی کتاب 'الرد علی الامم' اور مارٹن کی کتاب "مذاہب کا خنجر"، دونوں کتابیں ڈومی نی کن مبلغوں کے صدر ریمونڈ دا پنافورت (Raymund de Pinnaforte) کی درخواست پر لکھی گئی تھیں، ان کتابوں کے بعض ابواب میں مشابہت اس کی شاہد ہے، بعض نہایت اہم سوالات جن پر سینٹ تھامس اور غزالی اتفاق کرتے ہیں یہ ہیں الہیاتی مسائل کے حقایق کی تشریح یا اثبات میں عقل کی قدر و قیمت۔ خدا کے وجود کے اثبات میں ممکن اور ضرورت کے تصورات، خدا کے کمال ہی میں اس کی وحدانیت کا متضمن و مضمر ہونا، رویت الٰہی کا امکان، خدا کا علم اور خدا کی سادگی، خدا کا کلام، خدا کے اسماء، معجزات رسولوں کے فرمودات کی صداقت کے شاہد ہیں، عقیدۂ بعث بعد الموت۔

جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں بعض اوقات سینٹ تھامس مسلمان علمائے دین کے مختلف دبستانوں کا حوالہ دیتا ہے، اس طرح وہ اپنی کتاب 'الرد علی الامم' کے باب سوم کے صفحہ (۹۷) پر لکھتا ہے: "سب سے پہلے تو ان لوگوں کی غلطی ہے، جن کا عقیدہ ہے کہ تمام اشیاء عقل کے بغیر مجرد ارادۂ الٰہی کا نتیجہ ہیں، یہ مسلمان متکلموں کی غلطی ہے جو وہ شریعت کے بیان میں کرتے ہیں، موسی بن میمون الربانی کا قول ہے کہ آگ جلاتی اس لیے ہے کہ یہی خدا کی رضی ہے، دوسرے یہ کہ ہم ان لوگوں کی اس غلطی کی تردید کرتے ہیں جن کا دعویٰ ہے کہ علل کے تسلسل کی ابتدا اضرورۃ خدا سے ہوتی ہے۔"

سینٹ تھامس نے موسی (موسیٰ بن میمون کی کتاب جس کا عربی عنوان ہے "دلالۃ الحائرین"

---

[1] امام غزالی کے اس رسالہ کا نام ہے "الاقتصاد" ہے۔ (مترجم)

کا جو قول نقل کیا ہے اس سے واضح ہوتا ہے کہ اس سلسلہ میں اشاعرہ اور معتزلہ کے بارے میں
اس کی معلومات کا ماخذ براہ راست عربی نہ تھا، جو وجوہات اوپر بیان کیے گئے ہیں، ان کی
بنا پر یہ غیر یقینی معلوم ہوتا ہے کہ صرف موسیٰ ابن میمون ہی سینٹ تھامس کی معلومات کا واحد ماخذ
تھا، گو ذہنی لحاظ سے غزالی سینٹ تھامس سے کم درجہ پر نظر آتے ہیں، پھر بھی دونوں میں بہت سی
باتیں مشترک ہیں اور ان کی غایت، ان کے رجحانات اور ان کے مقاصد بھی مشترک تھے،
کسی مسئلے کی مخالفت میں اپنا فیصلہ دینے سے پہلے دونوں اس مسئلے کو تفصیل سے بیان
کرتے ہیں، دونوں نے اپنے عقیدہ کو مدلل طور پر پیش کرنے کے لیے فلسفہ کے خلاصے تیار کیے،
دونوں نے خدا کے صوفیانہ ادراک سے لذت اٹھائی اور اس کا اعتراف کیا ہے کہ اس
سلسلہ میں جو ابتدائی کوششیں انھوں نے کی تھیں وہ ہیچ تھیں،

(باقی)

ملکۂ نور جہاں کے سلسلۂ مادری و پدری کے اہم افراد

از ڈاکٹر نذیر احمد صاحب مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

نور جہاں کو ہندوستان کی تاریخ میں جو عظمت حاصل ہے وہ کم لوگوں کو نصیب ہوئی ہوگی،
اور صنف نازک میں تو غالباً وہ سب سے ممتاز شخصیت کی مالک ہوگی حسن صورت و حسن سیرت کے
ساتھ ایجاد واختراع کی غیر معمولی صلاحیت اس کو ودیعت کی گئی تھی، انتظام سلطنت میں
غیر معمولی ملکہ بہم پہنچایا تھا، کردار کی بلندی اس سے زیادہ کیا ہو سکتی ہے کہ تاج شاہی قدموں
پر نثار ہو رہا ہے، مگر وہ اپنے شوہر کی یاد میں تاج کو ٹھکرا دیتی ہے، غرض اس کی ذات
حسن صوری ومعنوی کا بیش بہا مرقع اور ایک مثالی کردار پیش کرتی ہے۔

نور جہاں کے فضائل بہت کچھ اس کی خاندانی عظمت کے رہین منت ہیں، وہ
ایران کے نہایت ممتاز ومقتدر خانوادے کی ایک فرد تھی، اس کا ننھیالی اور ددھیالی
دونوں خاندان حسبی ونسبی شرافت کے ساتھ دنیاوی جاہ وجلال کا مالک تھا، اس مضمون میں
ان ہی خاندان کی بعض اہم شخصیتوں کا تعارف کرایا جا رہا ہے، جس سے نور جہاں کی شخصیت
کے مطالعہ میں مدد مل سکے گی، مگر قبل اس کے کہ اصل مضمون شروع کیا جائے دونوں خاندانوں

کا شجرۂ نسب مختصراً پیش کیا جاتا ہے،

(الف) شجرۂ پدری

- خواجہ علی
  - (؟)
  - گشتاسپ
    - دختر
      - دختر
        - خواجہ محسن
    - خواجہ مرزا احمد
      - خواجہ عبد الرضا
        - خواجہ محمد رضا
      - امین احمد رازی (صاحب ہفت اقلیم)
    - خواجہ محمد شریف ہجری
      - مرزا غیاث بیگ (اعتماد الدولہ)
        - مرزا ابو الحسن آصف جاہ
          - ارجمند بانو ملکۂ شاہجہاں
        - ابراہیم خاں فتح جنگ
        - نور جہاں بیگم
        - شاپور مرزا اعتقاد خاں
        - محمد شریف مقتول
        - خدیجہ بیگم زوجہ حاکم بیگ
          - دختر زوجہ باقر نجم ثانی
            - مرزا صابر
            - فاخر خاں
      - محمد طاہر وصلی
        - خواجہ محمد رضا [ق]
    - خواجہ خواجگی
      - شاپور رازی
  - لہراسپ[له]
  - ارجاسپ (امیدی)
    - خواجہ محمد طاہر

(ب) نسب نامۂ مادری

- آقائے ملا دوات دار قزوینی
  - بدیع الزماں وزیر کاشان
  - خواجہ غیاث الدین علی آصف خاں
    - مرزا قوام الدین جعفر آصف خاں
    - دختر زوجہ مرزا ابو الحسن پسر اعتماد الدولہ
    - نور الدین مقتول
    - دختر مرزا حسام الدین
    - پسر (یا پسران)
  - مرزا احمد بیگ وزیر خراسان
  - آقا محمد زماں عامل تبریز
  - دختر زوجہ مرزا غیاث بیگ اعتماد الدولہ پدر نور جہاں

له امیدی کے دادا اور بھائی کی اطلاع نفائس المآثر سے ملی، مگر یہ معلوم نہ ہوسکا کہ خواجہ محمد شریف وغیرہ ان دونوں میں سے کسی کے لڑکے تھے یا کسی دوسرے اور بھائی کے (نفائس المآثر بحوالہ المیخانہ ص ۱۲۶ حاشیہ)

نور جہاں کے پردادا کا نام خواجہ علی تھا، خواجہ کا خاندان رے[له] اور طہران میں سکونت پذیر تھا چنانچہ اس خاندان کے مختلف افراد رازی اور طہرانی (= تہرانی) دونوں نسبتوں سے یاد کیے جاتے ہیں۔ دونوں شہر بالکل قریب قریب آباد ہیں، اور دونوں کے درمیان فاصلہ برائے نام ہونے کی وجہ سے دونوں نسبت ان خاندان والوں پر پوری طرح صادق آتی ہے، رے تو قدیم میں نہایت اہم جگہ تھی، اور تہران اس کا ایک حصہ یا محلہ تھا، بہرحال نور جہاں کا آبائی خاندان رے اور طہران میں نہایت معزز و محترم تھا، تحفۂ سامی[۲] میں امیدی کے ضمن میں ہے:

"پدرش رئیس وکدخدائے آنجا بود"

دوسری بار[۳] پھر اسی تذکرہ میں ہے:

مولانا وصلی نیز از محلہ ساران (تہران) است و بزرگ زادۂ محلہ است"۔

خلاصۃ الاشعار[۴] میں شاپور کے حالات کے ضمن میں حسب ذیل فقرہ خاندان کی شرافت کا پتہ دیتا ہے:

تتبع آقربا و آبائے عظام خود نمودہ

تذکرۂ میخانہ[۵] میں ہے:

اباً عن جد ارباب و اکابر ولایت خود بودہ اند

خواجہ علی کے تین لڑکوں کے نام ملتے ہیں: ارجاسپ[۶]، گشتاسپ اور لہراسپ۔

---

[۱] آجکل اس کو حضرت عبد العظیم کہتے ہیں، مگر پہلے رے کے نام سے مشہور تھا، اس وقت بھی لبوں پر "شہر رے" ملتا ہے، میونسپلٹی کو "شہرداری شہر رے" کہتے ہیں [۲] تہران اڈیشن ص ۱۰۱

[۳] ایضاً ص ۱۶۲ [۴] مولفہ تقی کاشی اس کے دو نسخے میرے پیش نظر ہیں [۵] ص ۱۲۶ [۶] تحفۂ سامی نفائس المآثر، میخانہ، آتشکدہ وغیرہ میں یہی نام لکھا ہے۔

ارجاسپ امیدی کا باپ تھا، لہراسپ کے بارے میں نفائس المآثر[1] میں حسب ذیل اطلاع ملتی ہے:

لہراسپ بسیار خوش طبع بود، اشعار جد و ہزل بسیار دارد و مناظرِ ترک و گیلک

و چند نامہ از و مشہور است"

لیکن ان میں سب سے زیادہ نامور امیدی ہے جس کا حال ذیل میں درج کیا جاتا ہے،

امیدی: امیدی اواخر قرن نہم اور اوائل قرن دہم کا ایک اہم شاعر گزرا ہے، اسکی پیدائش کا سنہ معلوم نہیں ہے، البتہ میخانہ[2] میں وفات کے وقت اس کی عمر ۶۵ سال کے قریب بتائی گئی ہے، اور چونکہ سنہ وفات ۹۳۰ھ ہے اس حساب سے پیدائش کا سنہ ۸۶۵ ہجری قرار پاتا ہے، ابھی تھوڑی عمر تھی کہ تحصیل علم کے شوق نے آمادۂ سفر کیا، چنانچہ شیراز پہنچا اور وہاں[3] فضلا کے درس میں شامل ہوا، شیراز کے اساتذہ میں علامہ جلال الدین دوانی کا تحفۂ سامی[4] میخانہ[5] اور آتش کدہ[6] میں ملتا ہے، کہتے ہیں کہ اس شفیق استاد کی توجہ سے چند ہی دنوں میں سرآمدِ روزگار ہوگیا، میخانہ[7] میں ہے:

در اندک ایامی از توجہ مولوی از شاگردان ارشد ایشان شد و در جمیع علوم صاحب قدرت گردید...... و در علم طب آنقدر مہارت بہم رسانید کہ ہیچ یک از شاگردان مولوی مذکور را در آں فن میسر نشد

امین احمد رازی جو امیدی کا عزیز قریب تھا، ہفت اقلیم[8] میں اسی خیال کی ہمنوائی کرتا ہے:

"فنون فضائل از فحول افاضل اخذ نمودہ کواکب فواید از سپہر افادہ علمای خطہ بر ضمیرش تافت تا در فنون فضائل و کمالات منتہی گردید"

---

[1] بحوالہ میخانہ ص ۱۲۶ حاشیہ [2] ص ۱۲۸ [3] ص ۱۰۱ [4] ص ۱۲۶ [5] حواشی میخانہ ص ۲۹ [6] ص ۱۲۶ [7] نسخہ خطی لکھنؤ یونیورسٹی، نوشتہ ۱۰۴۲ھ ورق ۴۹۷ ب

کمالات و فضائل کی تحصیل کے بعد شاعری کی طرف توجہ کی، تحفۂ سامی[1]، نفائس[2] اور میخانہ[3] کی صراحت سے معلوم ہوتا ہے کہ خود اس کے استاد جلال الدین دوانی نے اس کا نام مسعود اور تخلص امیدی رکھا تھا، بہرحال چند دنوں میں اچھا خاصہ استاد ہوگیا، ہفت اقلیم[4] میں ہے:

پس ازان بشعر گفتن رغبت کردہ غرایب معانی و بدایع خیالات از دبو توع پیوست و بسبب وفور میلان خاطر جامع فضائل نفسانی امیر نجم ثانی پایۂ قدر و منزلتش از اقران در گذشتہ صاحب مکنت و ثروت گردیدہ۔

امیر نجم ثانی[5] کا نام مرزا یار احمد اصفہانی تھا، وہ امیر نجم گیلانی وکیل شاہ اسماعیل صفوی کا مصاحب تھا، امیر مذکور کے انتقال پر امور وکالت مرزائے اصفہانی کے سپرد ہوئے، اور وہ نجم ثانی کے نام سے مشہور ہوا، اس کے جاہ و حشمت اور شان و شوکت کی تفصیل تاریخوں میں ملتی ہے، ۹۱۸ھ[6] میں ازبکوں سے لڑنے کی غرض سے آمویہ ندی کو پار کر گیا، مگر بدقسمتی سے قتل ہوگیا، امیدی نے کئی قصیدے امیر مذکور کی تعریف میں لکھے ہیں۔

امیدی کا دوسرا ممدوح میر عبد الباقی[7] یزدی شاہ نعمت اللہ ولی کی چوتھی پشت میں تھا، شاہ اسماعیل (متوفی ۹۳۰ھ) نے نجم ثانی کے قتل کے بعد اس کو وکیل مقرر کیا، جو ۹۲۰ھ[8] میں جنگ چالدران میں مارا گیا، امیدی کو میر مذکور سے بڑی عقیدت تھی، چنانچہ اس کی مدح میں ایک قصیدے میں[9] اس طرح لکھتا ہے

مداحیم چو طے شد بشنو حکایت از دے ویرانہ ایست در وی دیوانہ ایست عاقل

---

[1] ص ۱۰۱ [2] بحوالہ میخانہ ص ۱۲۶ حاشیہ نمبر ۲ [3] میخانہ ص ۱۲۶ [4] ورق ۹۷ ب [5] مآثر الامرا ج ۱ ص ۸۰۴ [6] ایضاً اور عالم آرائے عباسی ص ۳۰، ص ۲۹۵ [7] ہفت اقلیم بذیل یزد، عالم آرا ص ۳۲ آتشکدہ ص ۱۰۹ [8] عالم آرا ص ۳۲ [9] میخانہ ص ۱۲۷

دیوانۂ کہ تدبیر در وی نکرد تاثیر | دیوانۂ کز زنجیر او در انساخت عاقل
دیوانۂ کز افسوں سازد جنونش افزوں | دیوانۂ کہ مجنوں شاگرد او دست حاصل
دیوانۂ ایست پرفن دیرینہ دشمن من | از وی مباش ایمن وز من مباش غافل
قتلش بچار مذہب جائز چو قتل افعی | دفعش بہفت ملت واجب چو دفع صائل

اس قصیدے میں امیدی نے اپنے بڑے مخالف شاہ قوام الدین نوربخشی کی طرف اشارہ کیا ہے۔[1]

امیدی کا تیسرا اہم ممدوح خواجہ حبیب اللہ ساوجی تھا، وہ دورمیش[2] خاں کا وزیر تھا، شاہ اسماعیل نے دورمیش خاں کو سام مرزا کا اتالیق مقرر کیا، تو اسی سال یعنی ۱۰۲۷ھ میں خان مذکور نے حبیب اللہ کو اپنا وزیر منتخب کیا، امیدی خاں موصوف کا شناسا تھا، اور اسی کے ساتھ ۹۲۷ھ[3] میں خراسان گیا، اور وہاں کے اصحاب فضل و کمال سے بڑے حسن اخلاق سے ملا، معلوم ہوتا ہے کہ خراسان ہی میں حبیب اللہ ساوجی کی مدح بھی کی ہوگی، اگرچہ ہفت اقلیم نے وزیر مذکور کا نام صراحۃً نہیں لکھا ہے، مگر چونکہ حبیب اللہ نہایت ذی علم اور علما، و فضلا کا بڑا قدر دان تھا، اس لیے قرین قیاس یہی ہے کہ امیدی نے اس کو اپنا ممدوح ضرور بنایا ہوگا جیسا کہ میخانہ میں ذکر ہے، ساوجی ۹۵۰ھ[4] تک یعنی امیدی کی وفات کے بیس سال بعد تک ضرور زندہ رہا، اس کے نام متعدد کتابیں[5] معنون ہوئیں جن میں حبیب السیر مصنفہ خواند میر تحفۃ الحبیب ترجمہ مجالس النفائس مؤلفہ فخری امیری ہروی، رسالہ ہیئت مؤلفہ عبد العلی برجندی، وغیرہ قابل ذکر ہیں،

---

[1] شاہ کے حالات کے لیے ملاحظہ ہو ہفت اقلیم ورق ۳۹۰ ب، ۳۹۱ [2] بعض جگہ اس نام کا تلفظ "دورمش" ہے، مگر عالم آرای عباسی اور ہفت اقلیم میں "دورمیش" ہے، وہ شاملو خاندان کا ایک فرد تھا، سام مرزا کی اتالیقی کے علاوہ خراسان کا بگلربیگی بھی تھا، ۹۳۰ھ میں ہرات کے محاصرے کے وقت عبید اللہ خاں اوزبک کو زبردست شکست دی، ۹۳۱ھ میں انتقال ہوگیا (عالم آرای عباسی ص ۵۰ [3] ہفت اقلیم میں یہی تاریخ لفظوں میں درج کی ہے (ورق ۹۴ ب) مگر میخانہ میں اسی کتاب کے حوالہ سے ۹۲۸ لکھی ہے (حواشی ص ۳۰) [4] میخانہ ص ۱۴۴ س ۱۲ [5] ملاحظہ ہو حواشی میخانہ ص ۳۰

امیدی کو باغ سے بڑا شوق تھا، چنانچہ طہران ہی میں اس نے ایک خوشنما باغ لگایا تھا، جو باغ امید کے نام سے موسوم تھا، شاہ قوام الدین نے امیدی سے یہ باغ مانگا تو اس نے انکار کیا،[1] یہ عجیب سی بات معلوم ہوتی ہے کہ باوجود سخت مخالفت کے شاہ نے امیدی سے اس طرح کی خواہش ہی کیوں کی، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شاہ قوام کا خیال رہا ہوگا کہ وہ اپنے غیر معمولی رسوخ و اثر سے اس باغ کو ضرور لے لیگا، مگر امیدی کے انکار پر اس کے جذبۂ کبر کو سخت دھکا لگا جس کی تاب وہ نہ لا سکا، چنانچہ شاہ صاحب نے اس باغ کے چند درخت زبردستی کٹوا لیے، امیدی کو خبر لگی تو اس نے کہا:

این نوع اعمال از خردگان صادر بشود عجب کہ خدام شاہ بدین شیوہ عمل نمودہ باشند"

بھلا شاہ اس طرح کے اہانت آمیز جملے کا متحمل کیونکر ہوتا، اس نے اپنے مریدوں کو حکم دیا، انھوں نے ایک رات موقع پاکر امیدی کے باغ حیات کو قطع کر ڈالا، شاہ اسمٰعیل ان ہی دنوں میں فوت ہوا تھا، اسی لیے شاہ صاحب بچے رہے، جب شاہ طہماسپ تخت نشین ہوا اور اس کو یہ معلوم ہوا کہ شاہ صاحب کے بہت سے مرید ہیں، اور انھوں نے ایک نہایت مضبوط قلعہ بھی بنالیا ہے تو اس کو اس کی بیخ کنی کی فکر ہوئی، اور خراسان سے واپسی کے وقت اس کو گرفتار کرکے امیدی کے عزیزوں کے ساتھ قزوین لایا، اور امیدی کے خون کے بدلے میں اس کے سر اور داڑھی کے بال ترشواکر قید کردیا، اور قید ہی کی حالت میں شاہ قوام الدین کا انتقال ہوگیا،[2] امیدی کے سال قتل میں سخت اختلاف ہے، متعدد لوگوں نے قتل کی تاریخ ۹۳۰ھ قرار دی ہے اور یہی صحیح ہے۔

تذکروں میں امیدی کی شاعری کی بڑی تعریف کی گئی ہے، میخانہ میں ہے[3]:

---

[1] تحفۂ سامی ص ۱۰۱ ہفت اقلیم ورق ۳۹۰ ب و میخانہ ص ۱۲۷ [2] یہ تفصیل ہفت اقلیم ورق ۳۹۰ ب۔ ۳۹۱ ب پر موجود ہے۔ [3] ص ۱۲۷

اشعار آبدار آں یگانہ روزگار بمطالعہ این ذرہ بمقدار رسیدہ منظومات ایشان نشیانہ
است و بطرز ظہیر فاریابی حرف زدہ اند۔"

اس کے بعد مؤلف تذکرۂ مذکور رقم طراز ہے[1] کہ اگرچہ اس کی روش سلمان ساوجی سے ملتی
ہے لیکن سلمان سے بہتر ہے کیونکہ سلمان کے شعر میں ساختگی (تکلف یا آورد) زیادہ ہے، اور
امیدی کے یہاں بیساختگی ہے۔" نفایس المآثر[2] میں اسفرازی کا ایک قول نقل کیا ہے کہ اگر
امیدی کے قصائد خواجہ سلمان کے قصائد میں شامل کردیے جائیں تو انتخاب کرنے والا امیدی
ہی کے قصیدے منتخب کرے گا۔ تحفۂ سامی[3] میں تو یہاں تک ہے

"و بے تکلف از متاخرین کسے قصیدہ را بہتر ازو نگفتہ"

ان اقوال سے صاف ظاہر ہے کہ اس کا پایۂ شاعری بہت بلند تھا، خصوصاً قصیدہ میں
اس نے غیر معمولی دستگاہ پیدا کرلی تھی، جیسا کہ آتشکدہ[4] کا بھی خیال ہے

"بیشتر اوقات صرف قصیدہ گوئی کردہ ... بغزل سرائی چنداں مایل نبود"

چنانچہ امین احمد[5] نے ۱۰۰۲ھ میں اور عبدالنبی[6] نے ۱۰۲۸ھ میں اس کے متداول اشعار
کی تعداد اس طرح لکھی ہے: قصیدہ ۱۷، غزل ۳، ساقی نامہ ایک، قطعہ رباعی چند،
مبتلا نے بھی اتنی تعداد گنا کر باقی کے متعلق کہا ہے کہ وہ دستبرد زمانہ سے بچ نہ سکا۔

برٹش میوزیم[7] میں اس کے دیوان کا ایک نسخہ ہے، جس میں ۴۳ صفحے ہیں اور بجز قصائد کے
اس میں کچھ نہیں۔ اس میں نثر میں ایک دیباچہ ہے جس کا مؤلف مسعود الحسینی ہے، اس نے لکھا ہے کہ
اس نے شاہ صفی (۱۰۳۸ھ - ۱۰۵۲ھ) کے حکم سے ان اشعار کو جمع کیا ہے، اس کا ایک قصیدہ بادلی

[1] میخانہ ص ۱۲۲ [2] بحوالہ میخانہ [3] ایضاً [4] ص ۱۰۱ [5] حواشی میخانہ ص ۱۳۱ [6] ہفت اقلیم ورق ۴۹۸
[7] میخانہ ص ۱۲۷ [8] ملاحظہ ہو فہرست ریو (ضمیمہ) ص ۲۶۹

کے کتاب خانے میں بھی پایا جاتا ہے[1]، یہ قصیدہ جو نجم ثانی کی مدح میں ہے برٹش میوزیم کے دیوان
کا پہلا قصیدہ ہے اور جو خلاصۃ الافکار اور دوسرے تذکروں میں منقول ہے۔ ہفت اقلیم[2] میں
یہ قصیدہ مع چند اور نظموں کے پایا جاتا ہے، نمونہ یہ ہے:

زہی خلقت بر فراز رکابت فروزاں چو بر آسماں نجم ثاقب
حریم ترا حوریاں بر حواشی جناب ترا قدسیاں بر جنایب
بزم تو جمعند خورشید رویاں چو در خانۂ مہ قرآن کواکب
دہد جود عامت بہر کس نصیبی چو صہبا بہی خوارہ حلوا بتایب
چراغ عدو کی کند خانہ روشن بود بی بقا پرتو صبح کاذب
فغاں مرا ساکنان جنابت اگر نشنوند از علو مراتب
دہ سال است سرگشتہ ام ہمچو گردوں زجور اعادی و طعن اقارب

دوسری نظم[3] کی چند بیت ملاحظہ ہوں:

ای امیدی نزد ارباب کمال شیوۂ امساک از ادراک نیست
کی بود امساک از ادراک چوں خامش للہ زہر از تریاک نیست
کج عطائی چند از نابخردی طعن امساک ار زنندم باک نیست
زانکہ در معیار طبع راستاں کج عطائیہا کم از امساک نیست

میخانہ[4] میں اس کے ساقی نامے کے ساٹھ شعر دیے ہیں، اس سے اندازہ ہوتا ہے
کہ ساقی نامہ مختصر لکھا تھا، چنانچہ آتشکدہ[5] میں ہے:

"ساقی نامہ گفتہ ہرچند بسیار مختصر است اما اشعار بلند متین دارد۔"

[1] فہرست بادلی نمبر ۱۰۱۷ [2] ورق ۴۹۰ [3] ایضاً [4] ص ۱۲۸ بعد [5] آتشکدۂ آذر ذیل امیدی

شکر کا مقام ہے کہ یہ ساقی نامہ آذر کو پسند آ گیا، ورنہ وہ ظہوری کے ایسے شہرۂ آفاق ساقی نامے کو قابل توجہ قرار نہیں دیتا۔ یہ ساقی نامہ اس طرح شروع ہوتا ہے:

حریفی کہ ایں نیلگوں خم از دست — شراب طہور و سقاہم از دست
دریں بزم ساقی گل چہرہ ایست — کہ ہر ساغرے را از و بہرہ ایست
شرابے کہ ساقی سرمست داد — بہر دست جامی کہ بایست داد
رحیقی کہ ساقی خود کام ریخت — باندازۂ کام در جام ریخت
بیا ساقی آں رشحۂ سلسبیل — کہ نور کلیمست و نار خلیل
بدہ تا فرو غش علم بر زند — بہستی من آتش اندر زند فقرا

خواجہ محمد طاہر: یہ امیدی کا لڑکا تھا،[1] امین احمد نے اسکے علم و فضل کا ذکر گو مختصراً مگر بڑی خوبی سے کیا ہے،[2]

بر فور سیاحت و کاروانی و صنوف عطوفت و مہربانی محلی بودہ ہموارہ ہمت
بسرانجام امور نویسند گی بیگماشتہ"

اور یہ بھی لکھا ہے کہ اپنے آبا کی سنت برقرار رکھتے ہوئے کبھی کبھی شعر بھی نظم کیا کرتا ہے۔ اور ایک بیت نمونے کی درج کی ہے۔ سام مرزا نے تحفۂ سامی میں وہی بیت نقل کی ہے، مگر نام طاہری رازی لکھا ہے[3] چونکہ اس تذکرہ میں بعض اور نام بھی غلط درج ہیں،[4] اس سے قیاس یہ ہے کہ یہ نام بھی صحیح نہیں لکھا ہے۔

خواجہ محمد شریف: خواجہ شریف اس خاندان کا گل سرسبد تھا، یہ نور جہاں کا دادا اور امیدی کا بھتیجا تھا۔ امیدی اور خواجہ شریف کے رشتہ کے بارے میں کسی قدر اختلاف رائے ہے، تحفۂ سامی میں آخر الذکر کو امیدی کا "برادر زادہ" قرار دیا ہے۔[5] اسی کی پیروی

[1] ہفت اقلیم ورق ۹۹ ب [2] ایضاً [3] ص ۱۴۱ [4] مثلاً ص ۱۳۶ پر بجائے محمد شریف کے شریف محمد [5] ص ۱۳۶

الٰہی نے بھی کی ہے،[1] خلاصۃ الاشعار میں تقی کاشی نے عزیز قریب بتایا ہے،[2] تقریباً اسی طرح کا قول آتشکدہ اور مجمع الفصحا کا ہے،[3] جن میں شاپور کو امیدی کی اولاد میں بتایا گیا ہے، ان تمام اقوال میں چنداں تضاد نہیں، البتہ نصیر آبادی نے شاپور کو امیدی کا بھانجا بتایا ہے،[4] جو بظاہر غلط ہے، خواجہ شریف اور شاپور کے باپ باہم بھائی تھے، اس لحاظ سے اگر اول الذکر امیدی کا بھتیجا ہے تو پدر شاپور بھی بھتیجا ہوگا، لیکن نصیر آبادی کے قول کی صحت کی صورت میں پدر شاپور امیدی کا بہنوئی ہوگا، جو ممکن نہیں ہے، کیونکہ اس صورت میں امیدی کی بہن شاپور کے باپ کی حقیقی پھوپھی ہونے کی بنا پر اس کی زوجیت میں نہیں آ سکتی، مزید براں شاپور امیدی سے تقریباً ۵۰ سال چھوٹا ہوگا،[5] اور پدر شاپور اس سے بھی زیادہ، عمروں کا یہ تفاوت اس قیاس کا موید ہے کہ امیدی کی بہن شاپور کے باپ سے منسوب نہیں ہو سکتی،

خواجہ شریف کی ولادت کی صحیح تاریخ معلوم نہیں، البتہ خلاصۃ الاشعار کے صرف ایک نسخے[6] میں وفات کے وقت یعنی ۹۸۴ھ میں[7] ۷۰ سال بتائی گئی ہے، اس اعتبار سے پیدائش کی تاریخ ۹۱۴ھ قرار پاتی ہے، وہ ایک بڑی شخصیت کا مالک تھا، علمی فضل و کمال کے ساتھ دنیاوی وجاہت بھی اس کے خاص حصے میں آئی تھی، فارسی کا اعلیٰ درجے کا شاعر اور ہجری تخلص کرتا تھا، چنانچہ تمام تذکروں میں اس کی شعری حیثیت قطعی طور پر تسلیم کی گئی ہے، اس کے دیوان کے دو نسخے دستبرد زمانے سے بچ کر ہمارے پاس تک پہنچے ہیں، خلاصۃ الاشعار میں ہے:[8]

علم نیکنامی و خیر اندیشی برمی افراشت و در خوش طبعی و سخنوری یگانہ و در زبان آوری
و مجلس آرائی مشہور زمانہ بود"

[1] فہرست اسپرنگر ص ۸۷، [2] ورق 259/262 "خویشان نزدیک" [3] ملاحظہ ہو میخانہ ص ۳۸، ج ۲ [4] ص ۲۳، [5] امیدی کی وفات ۹۳۰ھ اور شاپور کے چچا کی وفات ۹۲۴ھ میں ہوئی، بظاہر شاپور کے باپ کی وفات اس کے بعد ہوئی ہوگی، [6] نسخہ دوم ورق ۲۱۲/۲۱۷ [7] مگر یہ ۹۸۲ھ بھی پڑھا جا سکتا ہے اور یہی تاریخ آتشکدہ میں ہے (ملاحظہ ہو نسخہ بادلی نمبر ۴۶۱) [8] نسخہ قدیم ورق 259/262

معلوم ہوتا ہے کہ بہت سے شاعر و ادیب اس کے خوانِ احسان سے فیضیاب ہوئے، خلاصۃ الاشعار[1] سے پتہ چلتا ہے کہ ایک دفعہ دو اصفہانی شاعر جو بھائی بھائی تھے، اس کے ہاں آئے اور اس کی خدمت میں کچھ نظمیں پیش کیں، اور صلہ کے لیے اتنے تقاضے کیے کہ خواجہ ان سے مکدر ہو گیا، اور تنگ آکر ایک بیت میں ان دونوں کی ہجو کی، ان کے نام سلامی و کلامی تھے۔

دو چیز است بدتر ز تیر حرامی　　　کلام سلامی سلام کلامی

خواجہ ہجری کی شہرت کا آفتاب طلوع ہوتے ہی وہ خراسان جاتا ہے اور وہاں کے امیر الامرا سلطان محمد[2] شرف الدین اغلی کے یہاں بحیثیت وزیر کے منسلک ہو جاتا ہے، سلطان محمد شرف الدین کی امیر الامرائی کی تاریخ ۹۴۳ھ[3] کے بعد کی ہے، جب شاہ طہماسپ عبید خاں کو ہرات سے نکال کر قندھار کی مہم پر روانہ ہوتا ہے، اس تاریخ سے وفات تک سلطان محمد اغلی شاہزادہ سلطان محمد مرزا کی اتالیقی کے ساتھ امیر الامرائی کے فرائض بڑی خوبی سے انجام دیتا ہے۔ ۹۴۴ھ[4] میں ہرات [خراسان کا صدر مقام] کی خوشحالی کے لیے طرح طرح کی تدبیریں کرتا ہے۔ ہمایوں کے ایران[5] جاتے وقت ہرات میں شرف الدین اغلی اس کا زبردست خیر مقدم کرتا ہے۔ ۹۵۷ھ[6] میں عبید اللہ خاں اوزبک کے لڑکے عبد العزیز خاں کو پسپا کرتا ہے۔ مگر ان ہی ایام میں وہ فوت ہو جاتا ہے، اس سے اندازہ ہو گا کہ خواجہ ہجری ۹۴۳ھ میں اغلی خاں کی خدمت میں باریاب

[1] ورق ۲۵۹ [2] ہفت اقلیم ورق ۱۳۹۹ میں اس کا نام ایک بار تاتار سلطان ولد محمد خاں شرف الدین اغلی لکھا ہے، مگر بعد میں محمد خاں شرف الدین برابر ملتا ہے، بظاہر تاتار سلطان ولد اس کے نام کا جزو ہو گا۔ ولد سے یہ دھوکا نہ ہونا چاہیے کہ تاتار خاں اس کا نام تھا اور محمد خاں اس کے باپ کا۔ [3] عالم آرا میں ۵۰ مگر ریو ج ۱ ص ۱۵ اب پر ۹۴۱ھ عالم آرا ہی کے حوالے سے دی ہے۔ [4] عالم آرا ص ۶۶ [5] ایضاً ص ۹۷، ۹۸، نیز مآثر الامرا ج ۱ ص ۵۰۷ [6] عالم آرا ص ۹۳،

ہوا ہو گا، ہفت اقلیم[1] سے ظاہر ہوتا ہے کہ اغلی کی خدمت میں خواجہ کو بڑا اعزاز حاصل ہو گیا تھا، یہاں تک کہ اغلی نے سارے ملکی و مالی امور اس کے سپرد کر کے اس کو مطلق العنان بنا دیا تھا۔ شرف الدین کی وفات کے بعد اس کا لڑکا قزاق خاں اولاً معتوب و گرفتار ہوا لیکن پھر بہت جلد باپ کے عہدہ[2] پر سرفراز ہوا، خواجہ شریف قزاق خاں کی مدتِ حیات تک اپنے سابق عہدہ پر باقی رہا، ہفت اقلیم[3] میں ہے:

"و پس از فوت محمد خاں چند سال دیگر بوزارت ولد ارشدش قزاق خاں نہایت[4] کفایت بتقدیم رسانید و چوں او نیز از خلعتِ حیات منخلع آمد منظور نظر عنایت بیغایت شاہ طہماسپ گردید"

قزاق خاں کی وفات ۹۷۲ھ میں ہوئی، مآثر الامرا[5] سے پتہ چلتا ہے کہ وہ اپنے غیر معمولی اقتدار کی بنا پر اتنا مغرور ہو گیا کہ فرمان شاہی کی تعمیل میں فروگذاشت کرنے لگا، اس لیے بادشاہ نے ۹۷۲ھ میں ایک فوج شاہ معصوم بیگ صفوی وکیل السلطنت کی سرکردگی میں خراسان روانہ کی، قزاق خاں سلطان محمد کے ساتھ قلعۂ اختیار الدین میں محصور ہو گیا، مگر شاہی لشکر نے قلعہ پر قبضہ کر لیا، ان ہی ایام میں قزاق استسقا کے مرض میں وفات پا گیا۔ اور اس کی ساری جائداد معصوم بیگ کے قبضہ میں آگئی،

بہرحال قزاق کی وفات کے بعد شاہ طہماسپ نے خواجہ شریف پر مخصوص نظر کی اور الطاف شاہی سے نوازا،

[1] ورق ۱۳۹۹ [2] عالم آرائے عباسی میں ہے: "مجدداً بدارائی ملک خراسان منصوب گشتہ" بظاہر یہ دارائی امیر الامرائی کے ہم پلہ تھی۔ مگر شاہزادہ کی اتالیقی کے فرائض تکلی سلطان استاجلو کے سپرد ہوئے (ص ۹۳) مگر مآثر الامرا ج ۱ ص ۵۰۸ سے معلوم ہوتا ہے کہ مرزا محمد کا اتالیق بھی تھا۔ لفظ حاکم ان لوگوں کے نام درست طور پر منسوب نہیں ہو سکتا، حاکم تو بہرحال مرزا محمد ہی تھا [3] ورق ۱۳۹۹ [4] متن میں غراق خاں [5] ج ۱ ص ۵۰۸

اس کو یزد کا حاکم بنایا، چنانچہ ہفت اقلیم[1] کے بیان کے مطابق ۹ سال تک خواجہ مذکور یزد کیساتھ ابرقوہ اور بافق کا بھی وزیر رہا، اس حساب سے اسکی وزارت ۹۷۹ھ میں تمام ہوئی ہوگی، اس سنہ میں شاہ طہماسپ نے اسکو اصفہان کا وزیر مقرر کیا اور یہ اسکے اعزاز میں اضافہ کا نتیجہ تھا، ہفت اقلیم میں ہے[2]:

"چوں از روی نصفت وشہامت آں خدمت را بانصرام رسانید ہر آئنہ بوزارت اصفہان کہ نیمۂ جہان است مفتخر گردید"

اصفہان کی وزارت کے دوران میں بھی اس نے بڑی خوش انتظامی کا ثبوت دیا۔ "دولت عدل والصاف را دست افزار حصول نیکنامی نمودہ باستمالت رعیت و سپاہ می پرداخت و درکمال جاہ و جلال روز میگذرانید"[3] یزد اور اصفہان کی وزارت کا ذکر عالم آرائے عباسی[4] اور خلاصۃ الاشعار میں بھی ہوا ہے، اور آخر الذکر[5] میں اس کی نیکنامی اور خیراندیشی کا تذکرہ بھی پایا جاتا ہے۔

خواجہ شریف ہجری کی وفات کا قطعہ مولانا ضمیری اصفہانی نے لکھا "دگر گردید یکی کم ز ملاذ وزرا" کے فقرے سے سال وفات ۹۸۴ھ[6] نکلتا ہے، خلاصۃ الاشعار کے قدیم نسخہ[7] میں لکھا ہے کہ خواجہ نے یزد میں وفات پائی، مگر اسی تذکرے کے دوسرے نسخے[8] میں یزد کے بجائے اصفہان ہے۔ جو اس لحاظ سے زیادہ قرین قیاس ہے کہ انتقال سے قبل وہ وہاں کا حاکم تھا، مگر خلاصۃ الاشعار کا قدیم نسخہ ۹۹۳ھ کا نوشتہ ہے۔ اور یہی سنہ اس کا سال تالیف ہے،

[1] ورق ۱۳۹۹ [2] ایضاً [3] ایضاً [4] ص ۱۶۵ [5] نسخہ اول ورق ۲۵۹ نسخہ دوم ورق ۱۲۱۶ [6] مگر خلاصۃ الاشعار کے نسخہ دوم میں ۹۸۲ بھی پڑھا جا سکتا ہے، مزید ملاحظہ ہو بادلے نمبر ۱۶۱۴ جہاں آتشکدہ کے حوالے سے ۹۸۴ھ درج ہے، خواجہ غیاث کی روانگی ہند ۹۸۴ھ سے قبل ثابت ہوتی ہے کیونکہ نورجہاں جو حالت سفر میں پیدا ہوئی تھی اور ۷۲ سال کی عمر میں ۱۰۵۵ھ میں مری (مآثر الامراء ج ۱ ص ۱۳۴) اور یہ معلوم ہے کہ باپ کی وفات کے بعد مرزا غیاث عازم ہندوستان ہوا تھا، اس روایت کی صحت میں خواجہ شریف کی وفات ۹۸۲ھ میں ہوئی ہوگی۔ [7] ورق ۲۵۹/۲۶۲ [8] ورق ۱۲۱۶

اس اعتبار سے اس کا بیان نہایت وقیع ہے، اس سنہ کی تائید آتشکدہ[1] سے بھی ہوتی ہے۔ اگرچہ اس میں وفات کا سنہ ۹۸۲ھ دیا ہے۔ اور زیادہ قرین قیاس یہ ہے کہ یہی سنہ خلاصۃ الاشعار کے دوسرے نسخے میں بھی ہے[2]، مگر اسپرنگر نے اسی تذکرہ[3] کے حوالے سے ۹۸۴ھ بتایا ہے، ضمیری اصفہانی کی کہی ہوئی تاریخ بقید سنہ (یعنی ۹۸۴ھ) کے ہفت اقلیم[4] میں ملتی ہے، جو بہت زیادہ مستند ہے کیونکہ خواجہ ہجری خود مولف ہفت اقلیم کا چچا تھا، اگرچہ مولف نے صراحۃً اسکا اقرار نہیں کیا ہے، لیکن یہ اس اہم مصنف کی خصوصیت ہے کہ وہ باوجود خاندانی وجاہت کے کسی جگہ بھی دوسروں کے ذکر میں اپنا حوالہ نہیں دیتا اور سوائے چند جگہوں کے اپنے متعلق اشارۃً وکنایۃً بھی کچھ نہیں لکھتا، طہران اور آگرہ میں اس کے متعدد قریبی عزیز حکومت کے بڑے عہدوں پر فائز تھے، مگر مصنف نہ اس کے بیان میں مبالغے سے کام لیتا ہے اور نہ ان کے ذکر کے ساتھ اپنا ذکر کرتا ہے، غرض ان وجوہ سے ہمارے نزدیک اس کے عام بیان کو بڑی اہمیت حاصل ہونا چاہیے۔

(باقی)

[1] ملاحظہ ہو بادلی نمبر ۱۶۱۴ ۳۱۲ خلاصۃ الاشعار کے کئی ایڈیشن ہوئے، پہلا ۹۹۳ھ میں ہوا، چنانچہ اسی سنہ کا ایک نسخہ انڈیا آفس میں ہے جس کی نقل میرے پیش نظر ہے، دوسرا ۱۰۱۶ھ کا یا اس سے قبل کا، ایک ایڈیشن میں اشعار محذوف ہیں، یہی نسخہ انڈیا آفس میں ہے، اس کی نقل میرے سامنے ہے، کتابخانہ اودھ میں بغیر اشعار والا نسخہ موجود تھا، اور اس میں ۹۸۴ھ ہے، لیکن انڈیا آفس والے میں ۹۸۲ھ بھی پڑھ سکتے ہیں، جیسا کہ ہم پہلے لکھ چکے ہیں۔ [4] ورق ۱۳۹۹

حافظ کا مذہب

از مرزا محمد یوسف صاحب، استاذ عربی گورنمنٹ مدرسہ عالیہ رامپور

(۴)

(۶) چھٹا قرینہ حافظ کے تسنن پر ڈاکٹر صاحب نے یہ قائم کیا ہے کہ انھوں نے سنی شعراء کے مصرعوں کی تضمین کی ہے، فرماتے ہیں:

"حافظ نے بعض شاعروں کے مصرعوں پر گرہیں لگائی ہیں، منجملہ ان کے یزید کے مصرعہ کو الٹ کر اس کی تضمین کی"

لیکن یہ دلیل بھی دوسری دلیلوں کی طرح سقیم ہے، نیز ڈاکٹر صاحب نے جو کچھ ارشاد فرمایا ہے اس سے یہ واضح نہیں ہوتا کہ

(ا) حافظ نے صرف یزید ہی کے مصرعہ (؟ شعر) پر تصرف کیا، یا

(ب) یزید کے علاوہ دوسرے شعرا کے اشعار میں بھی تصرف کیا ہے۔

اگر ڈاکٹر صاحب کا خیال ہے کہ دوسرے سنی شعرا سے بھی حافظ نے استفادہ کیا ہے تو انکے نام اور استفادہ کی مثالیں دینا تھیں۔ خود حافظ نے خواجوے کرمانی کے تتبع کا اعتراف کیا ہے:

استاد غزل سعدی است پیش ہمہ کس اما دارد سخن حافظ طرز سخن خواجو

خواجو کے علاوہ، خیال ہے کہ انھوں نے ابن یمین فریومدی سے بھی بہت کچھ اخذ کیا ہے۔ مگر خواجو کرمانی اور ابن یمین دونوں کا تسنن و تشیع بحث طلب ہے۔ خواجو کے تشیع

کے ثبوت میں اس کے یہ اشعار پیش کیے گئے ہیں:

شاہ مرداں چون خلیل اللہ بصورت بت شکن شیر یزداں از رسول اللہ بمعنی یادگار

مہر او از آسمان لافتیٰ الا علی تیغ او از گوہر لا سیف الا ذوالفقار

کاشف سر خلافت راز دار لوکشف قاضی دین نبی مسند نشین ہل اتیٰ

مالک ملک "سلونی" "باب شہرستان علم" مالک اطوار لم یعبد شہ تخت رضا

سرو بستان امامت در دریاے ہدیٰ شمع ایوان ولایت نور چشم اولیاء

اور اس شعر کے بعد تو اس کے تشیع سے انکار آسان نہیں ہے

رہ بمنزل برد ہر کو مذہب حیدر گرفت آب حیوان یافت ہر کو خضر را رہبر گرفت

لیکن اگر حافظ کا تسنن محض اس بنا پر قرین قیاس ہے کہ انھوں نے یزید کے شعر سے اپنے دیوان کا افتتاح کیا تو یہ گمراہ کن استدلال ہے، کیونکہ اگر محض اس "تبرک و تیمن" کی وجہ سے حافظ شیعیت سے خارج ہوجاتے ہیں تو وہ سنیت سے بھی خارج ہوجاتے ہیں، یزید کی شخصیت جس طرح شیعوں میں مبغوض ہے، اسی طرح سنیوں میں بھی مبغوض ہے، حافظ جلال الدین سیوطیؒ جو اہل سنت والجماعت کے مستند عالم ہیں، فرماتے ہیں:

ولما قتل الحسين وبنو ابيه بعث	جب سیدنا امام حسینؓ اور ان کے بھائی بند شہید
زياد برؤسهم الی يزيد فسرّ	ہوگئے تو ابن زیاد نے ان کے سرہاے مبارک
بقتلهم اولاً ثم ندم لما مقته	یزید کے پاس بھیجے، پہلے تو ان کے قتل سے بہت
المسلمون علی ذالك وابغضه	خوش ہوا، مگر بعد میں بہت پچھتایا جب کہ
الناس وحق لهم ان يبغضوه	مسلمانوں نے ناگواری ظاہر کی اور لوگ اس سے
(تاریخ الخلفا للسیوطی ص ۱۴۱-۱۴۲)	ناراض ہوگئے اور لوگوں کا حق ہے کہ اس سے بغض رکھیں۔

ہاں اہل علم میں اتنی تنگ نظری کبھی نہیں رہی کہ اگر کہیں سے کوئی ادبی موتی ہاتھ آجائے تو محض اس بنا پر اس سے اعراض کرلیں کہ وہ کسی کافر یا بدعقیدہ کا مقولہ ہے، چنانچہ ونیداد ادبا، (سنی وشیعہ دونوں) نے عہد جاہلیت کے کافر ومشرک شعرا کا کلام روایت کیا، اس کو جمع کیا، اس پر شروح لکھیں اور بعض نے ان کے اسالیب کا تتبع کیا،

اس قسم کے بچر پوچ تشکیکات کا محمد بن محمد دارابی نے لطائف غیبیہ میں باحسن وجوہ جواب دیا ہے، ڈاکٹر صاحب نے بھی اس ضمن میں حسین نبرمان سے ایک لطیف جواب نقل کیا ہے، بااینہمہ انھیں اصرار ہے کہ

"بہرحال اس لطیفے کے بعد بھی اصلی بات اپنی جگہ پر باقی رہ جاتی ہے۔"

ایسی زیادتی کا کوئی علاج نہیں، لیکن اگر حافظ محض اس بنا پر زمرۂ تشیعیت سے خارج ہوئے کہ انھوں نے "قاتل آل رسول" کے شعر سے اپنا دیوان شروع کیا تو پھر ان کیلئے آغوش تسنن میں بھی کوئی جگہ نہیں ہے، اور یہ بحث کسی مزید وضاحت کی محتاج نہیں ہے، البتہ جناب ڈاکٹر صاحب کی قلت اعتنا کے متعلق ایک بات عرض کرتا ہوں۔ فرماتے ہیں:

"منجملہ ان کے یزید کے ایک مصرعہ کو الٹ کر اسکی تضمین کی، یزید کی بیت یہ ہے:

انا المسموم ما عندی بتریاق ولا راق ادر کاسا وناولہا الا یا ایہا الساقی

اس کا دوسرا مصرعہ حافظ کے دیوان کی پہلی بیت میں اس طرح آیا ہے:

الا یا ایہا الساقی ادر کاسا وناولہا کہ عشق آساں نمود اول ولے افتاد مشکلہا

ڈاکٹر صاحب نے نہایت بے پروائی سے دو بیتوں کو ایک بیت اور ایک شعر کو ایک مصرعہ قرار دیدیا، یزید کا وہ شعر جس سے حافظ نے اپنے دیوان کا افتتاح کیا ہے، حسب ذیل ہے۔

ادر کاسا وناولہا الا یا ایہا الساقی

ڈاکٹر صاحب اسے ایک مصرعہ سمجھتے ہیں جو یقیناً غلط ہے، غالباً ایرانی مصنفین حسین نبرمان وغیرہ کے تتبع میں انھیں یہ یاد نہیں رہا کہ بحر ہزج فارسی میں مثمن (ہشت رکن) ہوتی ہے مگر عربی میں اصلاً مسدس (شش رکن) ہوتا ہے، اور عملاً مجزو ہوکر صرف چار رکن پایا جاتا ہے۔ اور یزید کا یہ قصیدہ بحر ہزج مجزو میں ہے، جس کے عروض اور ضرب دونوں سالم ہیں، وزن قصیدہ کا حسب ذیل ہے:

مفاعیلن مفاعیلن مفاعیلن مفاعیلن

چنانچہ سکاکی نے مفتاح العلوم میں لکھا ہے:

اصل الهزج مفاعیلن ست مرات	بحر ہزج کی اصل مفاعیلن چھ مرتبہ ہے لیکن
وانه فی الاستعمال مجزوّ	وہ استعمال میں مجزو ہوتا ہے اور چار رکنی
مربع وله عروض سالمة و	پایا جاتا ہے، اس کی عروض سالم ہوتی ہیں
ضربان اولهما سالم....	اور ضرب دو ہیں، ضرب اول سالم ہے....
بیت الضرب الاول	ضرب اول کی بیت

عفا من آل لیلی السهب فالا ملاح فالغمر

تقطیعه مفاعیلن اربعاً	اس کی تقطیع مفاعیلن چار مرتبہ ہے

اس ناقابل تردید شہادت کے بعد پوری بیت

ادر کاسا وناولہا الا یا ایہا الساقی

کو صرف "ایک مصرعہ" قرار دینا اور دو کو دو ابیات

(۱) انا المسموم ما عندی بتریاق ولا راق

(۲) ادر کاسا وناولہا الا یا ایہا الساقی

کو "یزید کی ایک بیت سمجھنا طرفہ تماشا ہے"

غرض خارجی شہادتوں سے خواہ وہ سوانح نویسوں کی تصریحات ہوں یا قرائن و احتمالات خواجہ حافظ کا نہ تشیع ثابت ہوتا ہے نہ تسنن۔

لیکن اس بحث کو ختم کرنے سے پہلے مجھے "سرفراز"[1] کے فاضل مبصر کا شکریہ ادا کرنا ہے، انھوں نے بتایا ہے کہ صاحب عبقات شاہ عبدالعزیز صاحب کے شاگرد نہیں تھے، میں نے بربنائے شہرت لکھا تھا، لیکن چونکہ جناب مبصر نے اپنے ارشاد کی تائید میں صاحب عبقات کی تاریخ ولادت اور شاہ عبدالعزیز صاحب کی تاریخ وفات دی ہے، اور اول الذکر کی سوانح حیات کے باب میں اصولاً ان کی معلومات وقیع سمجھی جانا چاہئیں، لہذا مجھے اپنی گذارش پر کوئی اصرار نہیں ہے۔

مگر اس سے اصل مسئلہ پر کوئی اثر نہیں پڑتا، شیعی اساتذہ کے سنی تلامذہ اور سنی اساتذہ کے شیعی تلامذہ عموماً ہوتے رہے ہیں، جس کی زندہ مثالیں بھی موجود ہیں، اس کی تفصیل موجب تطویل ہوگی۔

---

[1] معارف: اس فروگذاشت کی جانب جناب اختر علی صاحب تلہری نے بھی توجہ دلائی تھی اور ایک مختصر استدراک لکھکر بھیجا تھا، مضمون نگار کی اس تحریر کے بعد اس کی اشاعت کی ضرورت نہیں معلوم ہوتی۔

وفیات

افضل العلماء ڈاکٹر عبدالحق (مرحوم)

(از جناب پروفیسر رشید احمد صاحب صدیقی مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ)

مدراس کے ریلوے اسٹیشن پر ایک اجنبی مسلمان اس فکر میں مضطرب پھر رہا تھا کہ رات بسر کرنے کے لیے کوئی جگہ مل جائے، اسٹیشن کے چھوٹے بڑے اہل کار کسی نہ کسی سبب سے اس کی طرف متوجہ نہ ہوئے، اتنے میں ایک طرف سے ایک ہندو نوجوان نمودار ہوا، اجنبی کی پریشانی دیکھکر قریب آیا، وجہ دریافت کی، صورت حال معلوم ہونے پر اسے ایک جگہ اطمینان سے بیٹھ جانے کو کہا اور خود دیر تک آفسوں کا چکر لگاتا رہا، کبھی بابوؤں سے ردوقدح کرتا، کہیں منت سماجت، بالآخر واپس آیا اور مسلمان کو مطلوبہ جگہ پر پہنچا دیا، مسلمان نے حیرت اور شکر گزاری کے ساتھ ہندو دوست سے متعارف ہونا چاہا تو بڑے اصرار کے بعد اس نے بتایا، مجھ پر ایک زمانہ بڑے آلام و افلاس کا گزرا ہے، نہ کوئی سہارا دینے والا تھا نہ دلاسا۔ اس مایوسی اور بے بسی کے عالم میں ڈاکٹر عبدالحق کی خدمت میں پہنچا اور اپنی مصیبت بیان کی، سب کام چھوڑ کر بڑی شفقت سے پیش آئے، امید بندھائی اور روزگار کا ایسا بندوبست کر دیا کہ میری زندگی کی کایا پلٹ گئی، میں نے انکے احسان کو اس طرح محسوس کیا جیسے مجھ میں بڑی اچھی صلاحیتیں ابھر آئی ہوں اور مایوسی و بیزاری سے ہمیشہ کے لیے چھٹکارا مل گیا ہو، پھر میں نے ایک عہد کیا کہ جب تک جیوں گا جس

مسلمان کو تکلیف اور تردد میں دیکھوں گا حتی الوسع اس کی مدد کروں گا !

پچھلے سال کا ذکر ہے میری لڑکی اور داماد ایک طویل سیاحت سے فارغ ہو کر جاپان سے سیلون پہنچے، خط بھیجکر مجھ سے خواہش ظاہر کی کہ کوئی ایسا انتظام کردوں کہ ایک دو روز مدراس میں قیام کر کے وہاں کی سیر کرلیں، میں نے ڈاکٹر صاحب کو لکھا، سب جانتے ہیں کہ ڈاکٹر صاحب کا شمار مدراس کے مصروف ترین لوگوں میں ہوتا تھا، پبلک سروس کمیشن کی ذمہ داریوں کے علاوہ اپنے یا دوسروں کے معلوم نہیں کتنے اور کام اپنے ذمہ لے رکھے تھے، اس کا اندازہ اس سے کیا جاسکتا ہے کہ ان کی کوٹھی پر چھوٹے بڑے طرح طرح کے لوگ طرح طرح کے کاموں سے صبح سے رات تک برابر آتے جاتے رہتے اور ڈاکٹر صاحب ان سب سے بڑی توجہ اور تلطف سے پیش آتے، جیسے کسی ایسے معالج کا مطب ہو جہاں ہر مریض کا علاج مفت کیا جاتا ہو، اور مطب صبح سے رات گئے تک مسلسل کھلا رہتا ہو، یہی نہیں بلکہ علاج کی نوعیت بھی جداگانہ ہو، مثلاً دوا، دعا، گنڈا تعویذ، دان پن، سعی سفارش، رشتہ ناتا، اتنا ہی نہیں بلکہ بیچ بیچ میں آؤٹ ڈور پریکٹس پر بھی نکل جاتے، کسی سے چندہ مانگنے کے لیے کسی سے سفارش کرنے کہیں تقریر کرنے کہیں شادی غمی میں شریک ہونے کبھی کسی مہمان کو مدراس کی سیر کرانے !

ڈاکٹر صاحب کسی ضروری کام سے مدراس سے باہر جانے والے تھے، میرا خط ملا تو پروگرام ملتوی کردیا، ہوائی جہاز کے اڈے پر پہنچے اور دونوں کو اپنے گھر لائے، ڈاکٹر صاحب کے لیے بالکل آسان تھا اور اس میں نزاکت یا قباحت کا کوئی پہلو نہیں نکلتا تھا کہ گھر والوں کو ضروری ہدایات دے کر دورے پر چلے جاتے، میں جانتا ہوں مہمانوں کی خاطر مدارات میں کسی طرح کی کمی نہ آتی، اس لیے کہ بیگم صاحبہ اور بچوں کی عزت و محبت کے سلوک سے میں خود ایک بار بہرہ مند ہوچکا تھا، اس وقت کس حسرت سے وہ موقع یاد آتا ہے جب میرے لیے ہر طرح

کی سہولت فراہم کر کے ڈاکٹر صاحب نے پہلے پہل مدراس بلایا تھا، میری اس "زحمت فرمائی" سے ان کو کتنی مسرت ہوئی تھی، جیسے "زفرق تا بقدم" شاداب و شادماں ہوگئے ہوں! اخلاص اور اخلاق برتنے کا ڈاکٹر صاحب کا "ٹکنک" جداگانہ تھا، وہ اپنے الطاف و اکرام کا پورا اندوختہ کامل اعتماد اور افتخار سے پہلے ہی بار ہر اس شخص پر لگا دیتے تھے جس کو اسکی ضرورت ہوتی، انکے اس طریقہ کار سے جرمنوں کے اس معروف اصولی جنگ کی یاد تازہ ہو جاتی ہے جہاں بتایا گیا ہے کہ دشمن کے کمزور پہلو پر حرب و ضرب کی اپنی پوری طاقت یکبارگی مرکوز کردو!

ڈاکٹر صاحب نے اسی پر اکتفا نہ کی، اپنے گھر پر ان کے لیے ایک طرح کی پکنک کا انتظام کیا، میری لڑکی، داماد اور نواسہ نیز اپنے لڑکے لڑکیوں کو پاس بٹھالیا، انگیٹھی منگائی، کھانے پکانے کی طرح ڈالی، پکاتے جاتے اور بتاتے جاتے کہ مدراس میں مسلمانوں کے یہ کھانے اور مٹھائیاں نوابوں کے دور حکومت سے مشہور چلی آتی ہیں، یہ چیزیں کھانے کی میز پر دوسری چیزوں کے ساتھ چنی جاتی ہیں اصرار سے کھلاتے اور ان کی لذت اور لطافت بیان کرتے، کبھی سبھوں کو ساتھ لیکر مدراس کی سیر کو نکل جاتے، مختلف مقامات کی تاریخی اہمیت بتاتے، اپنے جمع کیے ہوئے طرح طرح کے تاریخی نوادر اور مسلمانوں کے عہد کی قلمی کتابیں، نقاشی، وصلیاں، مغربی مصوری کے بعض شاہکار دکھاتے اور انکی صراحت اس لطف سے کرتے جیسے تاریخی حقایق نہیں بلکہ لطیفے بیان کر رہے ہوں!

باوجود ان باتوں کے مجھے نہیں لکھا کہ انھوں نے میری فرمایش کس خلوص اور خوبی سے پوری کردی تھی، اپنا کتنا ہرج کیا تھا، یا پھر اس طرح کی فرسودہ رسمی معذرت کرتے کہ انھوں نے کیا ہی کیا تھا، گھر میں جو دال دلیا تھا، وہ پیش کردیا، بہت کم قیام کیا، مہمان کو بڑی تکلیف ہوئی امید ہے کہ معاف فرمائیں گے وغیرہ! مدراس میں قیام اور ڈاکٹر صاحب کی مہمان نوازی

اور شفقت کی تفصیل مجھے اپنی لڑکی سے معلوم ہوئی جس نے علی گڑھ پہنچتے ہی سب سے پہلے ڈاکٹر صاحب
اور ان کے گھر والوں کی ثنا خوانی شروع کردی جیسے ڈاکٹر صاحب کے نہیں بلکہ اپنے کارنامے
کا ذکر کر رہی ہو،

اتفاق یہ کہ ڈاکٹر صاحب کو جلد ہی اکزیکیٹو کونسل کی میٹنگ میں شرکت کے لیے علی گڑھ آنا پڑا،
جس دن تشریف لائے اس سے ایک روز پہلے لڑکی داماد علی گڑھ چھوڑ چکے تھے، سنا تو متاسف ہوئے،
ان کے متاسف ہونے کا معصوم بزرگانہ متبسم انداز نہیں بھولتا، فرمایا، اس دفعہ علی گڑھ آنے کا شوق یوں
اور زیادہ تھا کہ سبھوں سے یہاں ملتا، میں نے کہا کہ سب آپ کی بیگم صاحبہ اور بچوں کی بڑی تعریف
کرتے تھے، کہنے لگے، ارے یہی تو ان کو بتانے آیا تھا کہ میرے گھر والے ان سب کو کتنا یاد کرتے ہیں!

عبدالحق صاحب کو ذاکر صاحب یہاں کی پرووائس چانسلری پر بڑے اصرار و اعتماد سے لائے
تھے، میرا خیال ہے کہ کسی اور کے کہنے سے وہ اپنے طرح طرح کے پھیلے ہوئے کاموں کو چھوڑ کر جن سے انکو بڑا
شغف تھا، یہاں آنے پر رضامند نہ ہوتے اس لیے اور کہ ان کاموں کو سنبھالنے اور ترقی دینے والا
اس نواح میں انکے سوا کوئی اور نہ تھا، آئے تو ذاکر صاحب نے اپنا مہمان بنا کر رکھا، اس زمانے میں یونیورسٹی ایک
نازک دور سے گزر رہی تھی، پرانی بساط اٹھ رہی تھی، نیا نظام استوار نہیں ہو پایا تھا، ذاکر صاحب یہاں کے
در و بست پر حاوی نہیں ہو پائے تھے کہ بیمار ہو گئے، طویل علالت کے بعد صحت بحال ہوئی تو امریکہ جانا پڑا،
عبدالحق صاحب نے وائس چانسلری کا کام سنبھالا،

اس حصۂ ملک اور اس یونیورسٹی میں ڈاکٹر عبدالحق اجنبی نہ تھے، تو کچھ زیادہ معروف بھی نہ تھے،
البتہ خاص خاص حلقوں میں لوگ اتنا جانتے تھے کہ مدراس میں مسلمانوں کے لیے ہر طرح کی تعلیمی سہولت فراہم
کرانے میں ڈاکٹر صاحب کا بڑا حصہ ہے، اسلامی علوم و ادب پر اچھی نظر ہے، علوم جدیدہ سے بھی آشنا
ہیں اور ہر جماعت میں وقعت کی نظر سے دیکھے جاتے ہیں۔

یہاں آئے تو لوگوں نے دیکھا کہ شکل صورت، وضع قطع، رہن سہن، شرعی مسلمانوں جیسی پرانی چال
کی ترکی ٹوپی سر پر، داڑھی، ڈنڈا، اٹنگا پاجامہ، پان کھانا، حقہ پینا، مصافحہ کرنا، جو جہاں بلائے بے تکلف
چلے جانا، ہر مجلس میں ہر چھوٹے بڑے سے ہنسنا بولنا، کسی نے میلاد پڑھنے کو کہا وہ پڑھ دیا، کسی نے
وعظ کہنے پر اصرار کیا وہ کہہ، یا کسی نے بچہ کی بسم اللہ کرا دینے کی درخواست کی وہ پوری کر دی، ذاکر صاحب
کی خوبصورت خورد سال نواسی (نیلوفر) بہت مانوس ہو گئی تھی، کاموں سے فرصت ہوتی تو اسے کبھی
گود میں لیے ہوئے کبھی انگلی پکڑ کر صبح شام لان پر ٹہلتے ہوئے اسکی خاطر تفریح کی باتیں کرتے رہتے،
کبھی وہ فرط مسرت سے بے اختیار ہو کر داڑھی پکڑ کر پوری طاقت سے کھینچتی تو اسے خوش کرنے کے لیے کراہتے
اور ہنستے، کہتے ارے اب معلوم ہوا تیری ہی ڈر سے تیرے نانا نے داڑھی چھوٹی رکھی ہے کہ تو کھینچ نہ پائے،
اچھا رہ جا اب تجھے گود میں نہ لوں گا، پیٹھ پر بٹھاؤں گا، پھر دیکھوں تو میری داڑھی پر کیسے قبضہ کرتی ہو
ان کا یہ مشغلہ اور مذاق برابر جاری رہتا چاہے ملنے کے لیے کوئی طالب علم آجاتا یا اسٹاف کا ممبر یا ضلع کا افسر
یا شہر یا مضافات کا کوئی رئیس، ملنے والے سے بھی باتیں کرتے جاتے اور بچی کی تفریح بھی بنے رہتے۔

ایک طرف نیلوفر جیسی خوبصورت چنچل ذہین بچی تھی، دوسری طرف ڈاکٹر صاحب کی نورانی شکل
اور لطف و رحمت سے لبریز آزمودہ کار محکم شخصیت، میں جب کبھی بچی کو ڈاکٹر صاحب کی گود میں یا انکی انگلی
پکڑے لان پر ٹہلتے دیکھتا تو ایسا محسوس کرتا جیسے قدیم، جدید کو زندگی اور زمانے سے روشناس کرا رہا ہو
نیز پرانی اور نئی قدروں کا ایک دوسرے سے کس سطح پر کیا رشتہ ہے، ادھر یہ قصہ تھا، ادھر یہ بات پھیلی
کہ ڈاکٹر عبدالحق تو قال اللہ و قال الرسول قسم کے مولوی تھے، علی گڑھ کو کیا جانیں اور ماڈرن یونیورسٹی
کے طور طریق کو کیا سمجھیں، کچھ ایسے لوگ جو دنیا کو ہر لعنت سے پاک اور ہر نعمت سے بہرہ یاب کرنے پر اپنے
آپ کو مامور اور دوسروں کو صرف فتور عقل و نیت میں مبتلا سمجھتے تھے، ڈاکٹر صاحب سے ملے اور اس طرح
گفتگو شروع کی جیسے ان پر علوم جدیدہ کے بصائر و معارف کے وہ دریچے کھول رہے تھے جن تک

ڈاکٹر صاحب کی رسائی نہ تھی یا عالمی نظم ونسق کے وہ نکتے واضح کر رہے تھے جن سے ڈاکٹر صاحب بے بہرہ تھے، یہ بھی کافی نہ سمجھکر کہیں کہیں خیرہ چشمی کی بھی جھلک دکھا دیتے، ڈاکٹر صاحب یہ ساری باتیں بڑے تحمل اور شفقت سے سنتے، کبھی مسکراتے کبھی داد دیتے، ایک آدھ کلمے ایسے بھی کہدیتے جس میں مسلمانوں کی اخلاقی روایات اور وقت کے مطالبات کے علاوہ یونیورسٹی کے تحفظ اور ترقی کے مسائل کیطرف اشارے ہوتے. وقتاً فوقتاً اس طرح کے انٹرویو ہوتے رہے اور فضا کچھ اس طرح بدلنے لگی کہ وہ لوگ جو اسلامی روایات کو قصۂ ماضی سمجھتے تھے ڈاکٹر صاحب کی ذات میں ان اقدار اور روایات کو ناقابل تسخیر سمجھنے لگے. یہانتک کہ بعض نے پچھلے طرز عمل پر اظہار پشیمانی کیا اور معافی کے خواستگار ہوئے، کچھ دنوں بعد جب ڈاکٹر صاحب یہاں سے تشریف لیجا چکے تھے، یہ فرمایش کی گئی کہ اسٹریچی ہال میں انگریزی میں تقریر فرمائیں، موضوع بحث کچھ اس طرح تھا، کیا فقہ اسلامی رومن لا سے ماخوذ ہے، ڈاکٹر صاحب فرمایش پوری کرنے پر آمادہ ہوگئے. ایک، ایک دن کے وقفے سے غالباً تین لکچر دیے، اسٹریچی ہال حاضرین سے لبریز ہوتا، بغیر کسی یادداشت کے سہل اور شستہ انگریزی میں بے تکلف تقریر کرتے، کتنی مدلل، پرمغز اور فکر انگیز وہ تقریریں تھیں، جہانتک مجھے معلوم ہے، قانون کا ڈاکٹر صاحب کا کوئی خصوصی مطالعہ نہ تھا، اس تقریر نے انکی قابلیت اور شخصیت کا نقش لوگوں کے دلوں پر ہمیشہ کے لیے بٹھا دیا! کتنے خوش ہوتے تھے جب کوئی طالبعلم کسی علمی موضوع پر ان سے رہنمائی کا خواستگار ہوتا. دقیق سے دقیق مسائل کی تشریح آسان سے آسان طریقوں اور مثالوں سے کرتے، کم لوگ ایسے ہوں گے جن کا علم اور اخلاق طلبہ کو اس طرح "اڈکر لگتا ہو" جتنا کہ ڈاکٹر صاحب کا!

ڈاکٹر صاحب کو میں نے علی گڑھ میں بھی کام کرتے دیکھا اور مدراس میں بھی، عجیب بات یہ تھی کہ وہ کام بہت زیادہ کرتے تھے لیکن مصروف بالکل نہیں نظر آتے تھے، برخلاف دوسروں کے جو کام بہت کم کرتے ہیں یا بالکل نہیں کرتے لیکن "مصروف" ہمہ وقت نظر آتے ہیں۔ وجہ یہ بتاتے ہیں کہ مصروفیت

کام سے نہیں ہے، احساس ذمہ داری سے ہے، یہ احساس اپنی ذمہ داری سے متعلق نہ ہو تو دوسرے کی ذمہ داری سے سہی! عام طور پر دیکھا جاتا ہے کہ کوئی شخص کام کرتے کرتے تھک گیا ہو، اور اٹھنا چاہتا ہو، اسی وقت کوئی دوسرا کام یا صاحب غرض آجائے تو وہ قدرۃً جھنجھلا پڑتا ہے. ڈاکٹر صاحب پر یہ حالت کبھی طاری نہیں ہوئی، کتنا ہی کام کتنی ہی دیر تک کیوں نہ کر چکے ہوں، کوئی اور کام یا صاحب غرض آجائے تو وہ اس سے اسی تازہ روئی سے متوجہ ہو جاتے تھے جیسے وہ اس سے پہلے صرف تفریح کر رہے تھے، کام اب شروع کریں گے. یہ بات میں نے بہت ہی کم لوگوں میں پائی، کہا کرتے تھے کہ مجھے نہ کام کھلتا ہے نہ صاحب غرض! کام کا نہ کھلنا تو سمجھ میں آتا ہے، اس لیے کہ صحت اور سکون میسر ہو تو کام کرنا اور کرتے رہنا زندگی کے نعائم میں سے ہے، لیکن بہ ثبات ہوش وحواس جس پر صاحب غرض نہ کھلتا ہو اسکو میں اولیاء اللہ کے طبقے میں جگہ دیتا ہوں، صاحب غرض سے یہاں میری مراد خود غرض سے ہے، اہل حاجت سے نہیں۔

ڈاکٹر صاحب نے ایسے گھرانے میں آنکھ کھولی جہاں علم اور دین کا چرچا تھا، اس عہد میں علم کا سرچشمہ دین تھا، ہر دین کا مقصد خدا کی اطاعت اور خلق کی خدمت ہے، یہ فضا جوہر قابل کے لیے یوں ہی کیا کم سازگار ہوتی ہے کہ اس پر معاشی تنگ حالی سونے پر سہاگے کا کام کر گئی. ابتدائے زندگی میں تنگدستی سے بہتر اور سستی تربیت گاہ میں نے آجتک نہ دیکھی، بشرطیکہ تنگدستی کا یہ زمانہ محنت اور ایمانداری سے کاٹ دینے کی اللہ توفیق دے، اس پر ایک عزیز نے طنزاً فرمایا کہ اللہ کی توفیق ہی درکار ہو تو محنت مزدوری کے بجائے براہ راست دولت اور فراغت ہی کی دعا کیوں نہ مانگی جائے، میں نے کہا کہ بات ٹھیک ہے لیکن اللہ کے لیے عافیت اسی میں ہے کہ وہ مجھے محنتی اور ایماندار بنا کر خود کفیل بنا دے اور میری طرف سے بےفکر ہو جائے، آپ کو دولت و فراغت براہ راست دیکر وہ اپنی نت نئی مشکلات میں اضافہ کرنا کیسے پسند کریگا،

علم اور دین کے مطالبات ڈاکٹر صاحب نے تمام عمر جس پابندی اور خوبصورتی سے پورے کیے وہ مجھے کہیں اور کم نظر آئی، میری تقادیر کو بنانے میں اسلام کو بڑا دخل ہے، اسلام کا جو تصور پیش کیا گیا ہے یا جو میری

سمجھ میں آسکا ہو اس سے بڑا تصور انسان کے ذہن و تخیل میں نہیں آسکتا، انسان اسکو اپنے شایانِ شان اس پیمانے پر صرف خدا سوچ سکتا تھا، بایں ہمہ مجھے کوئی ایسا مسلمان نہ ملا جس کو میں اُس اسلام کا نمونہ پاتا جو میرے ذہن میں تھا، اسلام ہی نہیں، میں ہر مذہب کا بڑا احترام کرتا ہوں اور اپنے اس عقیدے کو اپنی بڑی جیت سمجھتا ہوں، لیکن مجھے اچھے مذہبی آدمی نہ ملے، بیشتر یہی محسوس ہوا جیسے مذہبی آدمی اپنے کو دوسرے سے علٰحدہ اور ممتاز سمجھتا ہو، جیسے اس میں "برہمنیت" راہ پاگئی ہو، اور وہ اپنے آپ کو مامور من اللہ سمجھتا ہو، لیکن وہ اتنی معمولی سی بات سے بے خبر ہوتا ہے کہ اگر وہ خدا کی طرف سے مامور کیا گیا ہو تو اسکا مامور ہونا اسکی آزمائش پہلے ہے فضیلت بعد میں، فضیلت برہمن کے حصے میں اور آزمائش شودر کے نصیبے میں آئے یہ کہیں اور ہوتا ہو تو ہو اسلام میں نہیں ہوتا، مامور من اللہ ہونے کی ذمہ داری لینا یوں بھی کوئی دانشمندی نہیں ہے!

اس گفتگو کا مقصد یہ بتانا تھا کہ ڈاکٹر عبد الحق کیسے انسان اور کیسے مسلمان تھے، انکو دیکھ کر میرے دل میں یہ آرزو پیدا ہوتی تھی کہ کاش میں بھی ایسا مسلمان ہوتا اور یہ میں نے اسلیے کہا کہ تمام عمر بے شمار مسلمانوں سے ملنے اور انکو دور اور قریب سے دیکھنے کا اتفاق ہوا، کوئی مسلمان ایسا نہ ملا جس کو دیکھکر میرے دل میں یہ خواہش پیدا ہوتی کہ ایسا مسلمان میں بھی ہوتا! اس کے ساتھ اس حقیقت کا بھی یہاں اعتراف کرتا ہوں کہ بہت ممکن ہے میرا سابقہ ایسے مسلمان سے ابتک نہ ہوا ہو، ورنہ ایسے مسلمان بے شمار ہوں، ممکن ہے اس کا سبب یہ بھی ہو کہ ڈاکٹر عبد الحق نے بحیثیت انسان اور مسلمان مجھے غیر معمولی طور پر متاثر کیا ہو، دوسرے اس حد تک متاثر نہ ہوئے ہوں، یہ سب صحیح ہے لیکن اس کو کیا کیا جائے کہ میں ذاتی پسند اور ناپسند کو بہت بڑی حقیقت سمجھتا ہوں ــــ انقلابی حقیقت! مجھے تو یہاں تک محسوس ہوا ہے کہ جو لوگ مسلمان نہیں ہیں شاید وہ بھی ڈاکٹر عبد الحق جیسا مسلمان بننا پسند کرتے ہوں! اچھے مسلمان اور اچھے انسان کو میں نے ہمیشہ ایک دوسرے سے اتنا قریب پایا کہ کم سے کم میرے لیے اکثر ان میں امتیاز کرنا دشوار ہو گیا ہے!

ڈاکٹر صاحب نے دین کے معاملہ میں کبھی سمجھوتا نہ اپنے آپ سے کیا تھا نہ کسی دوسرے سے، جیسا کہ ہم

اکثر کرلیا کرتے ہیں یعنی عقائد و اعمال کی ذمہ داریوں سے بقدر ستر فیصدی اپنے آپ کو مستثنیٰ قرار دیے جانے کا رزولیشن باختیار خود پاس کر دیتے ہیں، ستر فیصدی غالباً یوں کہ مسلمانوں کو ہر نیکی کا اجر عموماً ستر گنا ہی ملتا ہے! وہ اسلام کے بتائے ہوئے عقائد پر کامل یقین رکھتے تھے اور ظاہر و باطن دونوں اعتبار سے ان پر عامل تھے، بایں ہمہ وہ اتنے خوش مزاج، زود آمیز، مخلص، ہوشمند اور ہمدرد تھے جیسے ہمارا آپ کا کوئی عزیز بے تکلف دوست، وہ کسی حال میں محتسب نہیں معلوم ہوتے تھے بلکہ سر سے پاؤں تک محب و مشفق تھے! جیسے ان سے دور یا علٰحدہ رہنا بد نصیبی اور انکا اعتبار حاصل نہ کرنا محرومی ہو، ان کے مخالفوں کے لیے بڑی مشکل یہ تھی کہ نہ ان کو متعصب قرار دے کر اپنا مطلب نکال سکتے تھے، نہ پرانے خیال اور پرانی چال کا آدمی کہہ کر ان کو نظر انداز کر سکتے تھے، انکی نظر جتنی علوم دین، تاریخ اور سیر پر تھی، اس سے کچھ کم واقفیت دنیوی علوم سے نہ تھی، یونیورسٹیوں کے قواعد و قوانین اور سرکاری تعلیمی دفاتر کے آئین و ضوابط پر ان کو پورا عبور تھا، ان سے کوئی یہ کہکر بازی نہیں لے جا سکتا تھا کہ اس ملک یا کسی دوسرے ملک کا جدید ترین اصول، نظام یا نصاب تعلیم یہ یا وہ تھا جس سے وہ آشنا نہ تھے، ڈاکٹر صاحب کو چھوٹی بڑی ہر طرح کی تعلیم گاہوں کے تمام مدارج اور معلومات سے گہری اور عملی واقفیت تھی!

ڈاکٹر صاحب نے ایک جگہ کالج میں تعلیم شروع کرنے کا اپنا بڑا دلچسپ اور عبرت انگیز قصہ لکھا ہے، بیان کرنے میں طوالت ہو گی، اس لیے نظر انداز کرتا ہوں، یہ اسی حادثے کا فیضان ہے کہ انھوں نے دوسروں کے لیے تعلیم کو آسان اور ارزاں بنانے میں تمام عمر اپنی اچھی سے اچھی صلاحیتیں صرف کیں، علوم مشرقیہ سے قطع نظر جہاں تک علوم جدیدہ کو مسلمانوں کے لیے آسان اور ارزاں بنانے کی کوشش اور کامیابی کا تعلق ہے، اور اس غرض سے انھوں نے جتنے کالج قائم کیے، وہ ایسا کارنامہ ہے جس میں ڈاکٹر صاحب کا ہمسر ریاست مدراس میں (شاید باہر بھی) نہ پہلے کوئی گذرا ہے نہ آج موجود ہے! انکے کارنامے

میں میں نے جتنی برکت دیکھی بہت کم کہیں اور نظر آئی، اچھے کاموں میں وہ تائید غیبی کے قائل تھے، اور اسکی بعض ایسی آپ بیتی سنایا کرتے کہ عقل دنگ رہجاتی، ہر اچھا اور بڑا آدمی تائید غیبی پر ایمان رکھتا ہے!

ڈاکٹر صاحب کو میں نے کبھی مایوس، مغموم یا منغص نہیں پایا، سوا ایک بار کے جب وہ متفکر نظر آئے، تمام دن ان پر یہ کیفیت طاری رہی، دوسرے روز حسب معمول ہشاش بشاش نظر آنے لگے، صورت حال کچھ اس طرح کی پیش آئی تھی کہ اس کو جوں کا توں رہنے دیا جاتا تو اس ادارے کے ایک بنیادی مقصد کو نقصان پہنچتا تھا، دوسری طرف اس کو دور کرنے یا بدلنے کی کوشش میں اسکا خدشہ تھا کہ کہیں ادارے کی شہرت نہ مجروح ہو جائے، فرماتے تھے، دن بھر اس فکر میں غلطاں پیچاں رہا، رات کو کھانے اور نماز عشا سے فارغ ہو کر اس مسئلے کا حل سوچنے بیٹھا، تمام شب اُدھیڑبن میں گذر گئی، فجر ہوتے حل سمجھ میں آیا اور اس کا فارمولا مرتب کر سکا، میں نے عرض کی فارمولے میں ایک آدھ جگہ فارمولا کم جرات زیادہ نظر آتی ہی، فرمایا آپ نے ٹھیک کہا لیکن ہر مؤثر اور کارآمد فارمولے میں دو تہائی سوجھ بوجھ، اور ایک تہائی جرات کا ہونا ضروری ہے حسب ضرورت آپ اس تناسب کو گھٹا بڑھا سکتے ہیں لیکن یہ چاہیں کہ بغیر جرات کے کام بنجائے تو یہ ممکن نہیں!

ایک صاحب کا بیان ہے کہ ڈاکٹر صاحب امریکہ سے واپس آرہے تھے، ڈاکٹر صاحب انکو لینے دہلی گئے، ایک صاحب اور ساتھ تھے، جہاز سے اترتے ہی ڈاکٹر صاحب نے علی گڑھ کا حال پوچھا، جو صاحب ساتھ تھے انھوں نے حالات اور واقعات کو مایوسانہ انداز میں بیان کرنا شروع ہی کیا تھا کہ ڈاکٹر صاحب نے بات کا رخ بدل دیا، اور اپنے مخصوص انداز خوش دلی و خود اعتمادی سے بولے نہیں ... صاحب، حالات ایسے نہیں ہیں کہ فکر مند ہوا جائے، یہ تو زندگی کے معمولات میں سے ہیں، جہاں اتنے تعلیم یافتہ نوجوان اکٹھا رہتے ہیں، کھاتے پیتے، پڑھتے لکھتے کودتے پھاندتے ہوں وہاں اس طرح کے واقعات پیش آتے ہی رہیں گے، اور اب تو ڈاکٹر صاحب آگئے ہیں سارے معاملات یوں بھی رو براہ ہو جائیں گے، یہ کہکر ڈاکٹر صاحب کو موٹر میں بٹھایا اور علی گڑھ

واپس آگئے اور ڈاکٹر صاحب نے دیکھا کہ صورت حال وہی تھی جو ڈاکٹر صاحب نے بیان کی تھی!

ڈاکٹر صاحب عربی فارسی کے عالم متبحر، اردو شعر و ادب کے شیدائی اور انگریزی اردو کے بڑے اچھے مقرر تھے، انکی تقریریں دلنشین، بے تکلف اور پر مغز ہوتی تھیں، ان کا مطالعہ اتنا وسیع، معلومات اتنی متنوع، ذہن اس درجہ رسا اور طبیعت ایسی شایستہ اور شگفتہ تھی کہ وہ کسی موضوع پر برجستہ بھی تقریر کرتے تو ایسا معلوم ہوتا، جیسے یہ موضوع انکے مدتوں کے مطالعہ کا نتیجہ تھا، اردو یا انگریزی میں گفتگو یا تقریر کرتے تو لب و لہجہ سے ظاہر ہوتا جیسے انھوں نے تمام عمر مدراس اور اس کے نواح میں نہیں بلکہ دہلی، لکھنؤ یا اس کے آس پاس بسر کی تھی۔

تقریر میں ڈاکٹر صاحب فلسفہ، منطق یا سائنس کے اسرار و غوامض کو دخل نہ دیتے، خطابت کے فن سے واقف ہونے کے باوصف اسکے حربوں سے کام نہ لیتے، نہ کسی شخص یا جماعت کا مذاق اڑاتے، نہ کسی کو رلانے ہنسانے کی کوشش کرتے، غرض آرایش گفتار کے لیے جو باتیں درکار ہوتی ہیں ڈاکٹر صاحب ان میں سے کسی کے محتاج نہ تھے، سیدھی سادی بات کہتے، لیکن ان کے کہنے کا انداز ایسا تھا اور اعتماد و اعتبار کی ایسی فضا پیدا کر دیتے تھے کہ بات دلوں کی گہرائی میں اتر جاتی اور خبر نہ ہوتی، ایسا کچھ احساس ہوتا جیسے جو کچھ ڈاکٹر صاحب کہہ رہے ہیں اس لیے اس کے صحیح اور معقول ہونے میں شک نہیں کیا جاسکتا۔

میرے نزدیک کسی شخص کا دلی یا لکھنؤ کا ہونا اس بات کی دلیل نہیں ہے کہ اس کا اردو کا لب و لہجہ بھی معیاری ہوگا، گفتگو میں صحت زبان ہی کافی نہیں ہی، لب و لہجہ کا شستہ و شایستہ ہونا بھی ضروری ہے، دلی کے بعض مشہور اشخاص یا گھرانوں سے قطع نظر دلی والوں کا لب و لہجہ بالعموم خشک اور خشن ہوتا ہے، اسکا سبب غالباً یہ ہی کہ اردو چونکہ "کھڑی بولی" پر مبنی ہی اس لیے دلی اور اس کے اطراف کے رہنے والوں کا لب و لہجہ بھی کھرا اور کھڑا ہوتا ہے، دوسری طرف جو لوگ کھڑی بولی کے علاقے سے علحدہ لیکن متجانس پراکرتوں کی سلاست اور شیرینی سے آشنا ہیں وہ اردو کے مناسب حال لب و لہجہ پر زیادہ

قدرت رکھتے ہیں، شمالی ہند کی پراکرتوں کے علاوہ چونکہ اردو کا گہرا ربط فارسی عربی زبانوں سے بھی ہے اسلیے بحیثیت مجموعی اردو لب لہجہ کے لوازم ایسے ہیں کہ ان سے عہدہ برآ ہونا یوں بھی آسان نہیں ہے، بتوں کی مانند اردو لب لہجے کے بھی ایسے کتنے شیوے ہیں جنکو ابتک نام نہیں دیا جاسکا ہے۔ ڈاکٹر صاحب مدراس کے ہوتے ہوئے صحیح اور فصیح اردو بولتے تھے، یہانتک کہ تلفظ کی کوئی "ضرب خفی یا جلی" ایسی نہ ہوتی جس سے اسکا شبہہ ہوسکتا کہ وہ شمالی ہند کے اس خطے سے تعلق نہیں رکھتے تھے جہاں کا اردو کا لب لہجہ معیاری ہے!

کسی ماضی کی اہمیت کا مدار محض اسکے ماضی ہونے پر نہیں ہے بلکہ اس پر ہے کہ کس حد تک وہ حال اور مستقبل کی صحیح اور صحت مند رہبری کرسکتا ہے، حال و مستقبل کی اہمیت اس بنا پر ہے کہ دونوں ماضی کے بطن سے پیدا ہوتے ہیں، اسلیے اصولاً یا کلیتہً ماضی سے روگردانی نہیں کرسکتے، ڈاکٹر صاحب کے دل میں اسلام اور مسلمانوں کے گذشتہ دینی، علمی اور تہذیبی کارناموں کا بڑا احترام تھا، یہ بات کچھ تو انکے مطالعے اور مشاہدے کا براہ راست نتیجہ تھی، اور کچھ اس خلقی ورثے کا تصرف تھا جو انکو اپنے خاندان کے اکابر سے ملا تھا، اپنے ان تصورات کی تشکیل میں وہ طرح طرح سے کوشاں رہتے چنانچہ ۱۹۴۲ء میں محمڈن کالج کی سلور جوبلی کے موقع پر انھوں نے اسلامی تہذیب تمدن کی ایک نمائش ترتیب دی تھی جس میں ایسے تاریخی شواہد اور نوادر اس سلیقے سے اس پیمانے پر پیش کیے گئے تھے کہ اس سے پہلے کہیں اور دیکھنے میں نہیں آئے تھے۔ اس نمائش کی تفصیلی روداد معارف کے صفحات میں شائع ہوچکی ہے۔ وہ نمائش تو اب میسر نہیں لیکن چاہتا ضرور ہوں کہ اسلامی تہذیب و تمدن کے طالب علم اس نمائش کی تفصیل کا مطالعہ معارف کے متذکرہ شمارے میں کریں۔

مجھے جو شے یا شخص اچھا نظر آتا ہے جی چاہنے لگتا ہے کہ وہ علی گڑھ کا ہو جائے۔ اس سلسلے میں ایک بار عرض کیا تھا، ڈاکٹر صاحب، مدراس کے سب سے اچھے آدمی کو (جہانتک مجھے علم ہے) علی گڑھ نے پالیا، اب اتنا اور چاہتا ہوں کہ آپ کی یہ نمائش بھی کسی طرح علی گڑھ آجائے، میری دانست میں یونیورسٹی کے ادارہ علوم اسلامیہ کا اسے ایک مستقل اور ممتاز جزء ہونا چاہیے۔ رفتہ رفتہ یہ شعبہ اسلامی تہذیب و تمدن کے ایک اعلی درجے

کے میوزیم کی حیثیت اختیار کرسکتا ہے، بہت خوش ہوئے، فرمایا تجویز نہایت مفید اور مناسب ہے، اس کے لیے تھوڑا بہت سرمایہ فراہم کرنا پڑے گا، دوڑ دھوپ درکار ہوگی، شخصی اثرات کو کام میں لانا پڑیگا، ہندوستان سے باہر دوسرے ممالک سے بھی مدد لینی پڑیگی، کچھ دنوں کی مسلسل کوشش کے بعد جو چیز آپکے ذہن میں ہے وہ عملاً سامنے آسکے گی۔ پھر ڈاکٹر صاحب علی گڑھ سے چلے گئے، اور اب جبکہ وہ اس جہان ہی میں نہ رہے، اس اسکیم کی حیثیت ایک خواب سے زیادہ نہیں رہ گئی ہے!

ڈاکٹر صاحب کے پاس عربی، فارسی، اردو کتابوں کا بڑا نادر قلمی اور مطبوعہ ذخیرہ تھا، اس طرح کے نوادر پر انکی معلومات نہایت وسیع تھیں، میں نے ان صحبتوں میں بھی انکو دیکھا ہے جہاں مخطوطات کے اچھے اچھے "اصحاب خبر و نظر" موجود ہوتے، سبھی ڈاکٹر صاحب کی وسیع اور تفصیلی معلومات پر متعجب ہوتے، ایک بار کچھ اسی طرح کا تذکرہ تھا، فرمانے لگے تعلیم حاصل کرنے انگلستان گیا تو وہاں دو ہی باتوں کی زیادہ فکر رہتی، ایک یہ کہ عربی، فارسی، اردو کے نوادر کہاں کہاں محفوظ ہیں، دوسرے یہ کہ مشہور مستشرقین کون کون تھے اور ان تک رسائی کیونکر ہو!

فرمانے لگے ہندوستان میں مخطوطات تک پہنچنے میں چند باتوں نے میری رہبری کی، اس طرح کے مخطوطے والیان ریاست یا رؤسا تک کھنچ کر پہنچ جاتے، کیونکہ زمانۂ حال تک یہی لوگ اصحاب علم و ہنر کے مربی ہوتے یا پھر اس طرح کے نوادر خانقاہوں میں یا سجادہ نشینوں کے ہاں ملتے، اسلیے کہ یہ بزرگان دین خود صاحب علم و فضل ہوتے اور اس طرح کے لوگوں کا ماویٰ و ملجا بھی۔ امور دین کی تلقین بھی اردو ہی میں کرتے تھے، اسلیے انکے فرمودات بیاضوں میں محفوظ ہوتے، میرے خاندان کے بزرگوں کا تعلق مختلف اور متعدد خانقاہوں اور سجادہ نشینوں سے کسی نہ کسی حیثیت سے رہا ہے، اسلیے اس طرح کے علمی اندوختوں سے مجھے واقفیت رہی ہے، ایک بات اور ہے جس پر لوگ بہت کم توجہ کرتے ہیں، مسلمانوں کے عہد حکومت میں ہندو حکمراں اور رؤسا بھی اس طرح کے مخطوطات کے شائق ہوگئے تھے، چنانچہ بعض بڑے قیمتی اور نایاب قلمی اور مطبوعہ نسخے انکے کتبخانوں میں آج بھی مل جائیں گے۔ مگر ان کے تلف ہو جانے کا امکان اب بہت بڑھ گیا ہے۔

ایک بار میں نے پوچھا، ڈاکٹر صاحب عربی فارسی سے آپ کا شغف تو سمجھ میں آتا ہے، اسکی سیاحی میں معلوم نہیں کتنی پشتیں گذری ہیں، یہ اردو کا شوق کہاں سے آیا۔ فرمایا مدراس اور اس کے نواح میں اردو کا چرچا قدیم الایام سے رہا ہے۔ یہاں کے مسلمان جب تک اردو میں دستگاہ نہ پیدا کر لیتے تعلیم اور تہذیب میں اپنے کو کامل نہ سمجھتے، اردو میں شاعری کرنا مہذب اور تعلیم یافتہ ہونے کی نشانی سمجھتے ہیں جس طرح مسلمانوں کے بعض قبائل میں یہ دستور ہے کہ جب تک کوئی نوجوان حج کر کے نہ آجائے قبیلے میں شادی کا مستحق نہیں قرار پاتا۔ البتہ اس مرتبے کے شاعر ادھر نہیں ہوئے، جیسے شمالی ہند میں ہوئے، پھر بھی اردو شاعری کو وہاں بڑی وقعت اور قبول عام نصیب رہا ہے مسلم یونیورسٹی نے اردو کی ایک جامع تاریخ لکھنے کا اہتمام کیا ہے۔ مدراس اور ارکاٹ کے مصنفین اور شعراء اور ان کی تصانیف کے بارے میں میں آپ کو بڑی مفید اور اہم معلومات فراہم کر دوں گا، ایک زمانے میں وہاں کی اردو تاریخ لکھنے کا ارادہ ہوا تھا، اس کے لیے کافی مواد بھی دستیاب ہو گیا، لیکن پھر دوسرے کاموں میں ایسا پھنسا کہ ادھر متوجہ نہ ہو سکا۔ میٹریل کے علاوہ بہت سی باتیں ذہن میں محفوظ ہیں، پھر ہنس کر فرمایا اگر پبلک سروس کمیشن مدراس کی مستقل صدارت نہ ملی تو کمیشن سے مستعفی ہو کر اس تاریخ کا کام کروں گا۔[1]

---

[1] آہ یہ کے معلوم تھا کہ جس دن یہ صدارت تفویض ہوئی اسی دن ڈاکٹر صاحب کے لبوں پر دفعتاً وہ تبسم نمودار ہوا جسے اقبال نے "نشان مرد مومن" بتایا ہے! اصغر مرحوم کا یہ شعر آج کتنے دنوں کے بعد یاد آیا ہے۔

کائنات: ہر گیا رُخ الامیں بیہوش تھے زندگی جب مسکرائی ہے قضا کے سامنے

زندگی کی کوئی آزمائش ڈاکٹر صاحب سے انکی خلقی مسکراہٹ چھین نہ سکی لیکن انکی آخری مسکراہٹ نے زندگی سے اسکی ہر آزمائش چھین لی! بعض دوستوں، عزیزوں کی وفات ایسی ہوتی ہے کہ خود اپنا جیتا رہنا بے غیرتی معلوم ہوتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کی رحلت کی خبر سنکر اسی طرح کی بے غیرتی کا احساس ہوا! اس موقع پر جزع و فزع، صبر و شکر، ایمان و یقین کے کتنے فقرے بے ارادہ یاد آتے ہیں لیکن کسی ایک کو لکھنے

(باقی حاشیہ ص ۷۵ پر)

سوچتا ہوں کہ ڈاکٹر صاحب نے علی گڑھ میں کم و بیش چھ ماہ قیام کر کے ہمارے دلوں میں جب اپنے لیے اتنے پاکیزہ اور قابل احترام خیالات و جذبات پیدا کر لیے جو اتنی کم مدت میں علی گڑھ میں آجتک کوئی اور نہ پیدا کر سکا تو ان لوگوں کا کیا حال ہوگا جن میں رہ کر اور جن کے لیے انھوں نے تمام عمر کام کیا۔ تعلیمی اور علمی ہی نہیں معلوم نہیں کتنے اور کام! یہ بات اور زیادہ احترام اور اچنبھے کی اس وقت معلوم ہونے لگتی ہے جب ہم یہ بھی جانتے ہوں کہ علی گڑھ کے لوگ کسی سے "راضی و خوشنود" ہونے میں ذرا دیر لگاتے ہیں، بہ نسبت مدراس اور نواح مدراس کے مسلمانوں کے جو زیادہ سیدھے سادے اور بہت جلد عقیدت اور احسانمندی کے جذبات سے متاثر ہو جاتے ہیں، ڈاکٹر صاحب کے یوں دفعتاً وفات پا جانے سے ان پر کیا عالم گذرا ہوگا!

کسی آدمی کے بڑے ہونے کی ایک پہچان یہ بھی ہے کہ اس کو غریبوں اور بچوں سے کتنی محبت ہے، ڈاکٹر صاحب کو ان دونوں سے بڑا شغف تھا، صاحبزادی کی شادی کی تو اسی دن اور اسی وقت بستی کی سات غریب لڑکیوں کی بھی شادی کرائی، ہر طرح کی مالی امداد پہنچائی اور ان کی برابر خبر گیری کرتے رہے، ڈاکٹر صاحب یقیناً دولت مند نہ تھے لیکن اچھے کاموں میں روپیے صرف کرنے کا بڑا حوصلہ رکھتے تھے، ایک بار کچھ اسی طرح کا ذکر آگیا تو فرمانے لگے، میں بڑا دولت مند ہوں اسلیے کہ میری اپنی دولت کے علاوہ دوستوں اور عزیزوں کی دولت بھی میرے لیے وقف رہتی تھی!

سائنس کانگرس کے سالانہ اجلاس میں ہندوستان کی تقریباً تمام یونیورسٹیوں کے نمائندے شریک ہوتے ہیں، اس کا گذشتہ اجلاس مدراس میں منعقد ہوا تھا، حسب دستور مسلم یونیورسٹی کے نمائندے بھی شریک ہوئے تھے، ڈاکٹر صاحب کی وہاں موجودگی علی گڑھ کے لوگوں کے لیے مزید کشش کا

(بقیہ حاشیہ ص ۷۴) کا جی نہیں چاہتا — خاکم بدہن اتنا بڑا مین تنا چھوٹا توازن کیسے قائم رہے، خوشی میں کبھی توازن نہیں کھوتا، غم میں قائم نہیں رکھ سکتا، اللہ تعالیٰ معاف فرمائے، وہ تو جانتا ہے اس طرح کا غم مجھ ناتوان کے لیے کیسی بے پناہ آزمائش ہے!

کا باعث تھی، جن کی خاطر تواضع، آرام و تفریح کو ڈاکٹر صاحب نے اپنی ذمہ داری قرار دے لیا تھا، زیادہ سے زیادہ جتنے اصحاب کی گنجایش ڈاکٹر صاحب کے گھر میں ہوسکتی تھی وہ تو وہاں ٹھہرے، بقیہ کا انتظام دوسرے تمام شرکاء کے ساتھ کانگرس نے علیحدہ کیا تھا، پبلک سروس کمیشن کی مصروفیت اور دوسرے کاموں سے تھوڑی سی بھی مہلت مل جاتی تو وہ علی گڈھ کے دوسرے نمایندوں کی خیر خیریت لینے نکل جاتے، جیسے ان سب کے میزبان مدراس میں وہی تھے، ایک دن علی گڈھ کے تمام لوگ ڈاکٹر صاحب کے ہاں ڈنر پر مدعو تھے، معلوم ہوا کہ دو چار اصحاب جو دور مقامات پر ٹھہرے ہوئے تھے، غالباً سواری کا انتظام نہ ہونے کے باعث آنہ سکے، ڈاکٹر صاحب بڑے مضطرب ہوئے اور گاڑی لیکر روانہ ہوگئے، سب کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر لائے، کھانا ختم ہونے کے بعد ان کو انکی قیام گاہ پر چھوڑ آئے اور طرح طرح سے بار بار معذرت کرتے رہے کہ انکے ذہن میں یہ بات کیوں نہیں آئی کہ ان مہمانوں کے لیے سواری کا انتظام کرنا تھا۔

ڈاکٹر صاحب کو علی گڑھ میں جو منزلت اتنی جلدی میسر ہوئی اسکے میرے نزدیک بعض واضح اسباب ہیں، باوجود ہر وقت کام میں مصروف رہنے کے وہ چھوٹے بڑے ہر شخص کیلئے اتنے ہی ارزاں اور سہل الحصول تھے جتنی سانس لینے کے لیے ہوا، ہمیشہ محبت اور عزت سے پیش آتے تھے، لوگوں کے دکھ درد کو حتی الامکان دور و کم کرنے کی کوشش کرتے، ان پر لوگوں کو بھروسہ تھا کہ وہ کسی شخص یا جماعت کی ناواجب پاسداری نہ کرینگے، لوگ جانتے تھے کہ وہ قاعدہ و قانون سے نہ صرف پورے طور پر واقف تھے بلکہ انکی پابندی سمجھداری اور ہمدردی سے کرتے تھے، کوئی شخص خواہ کتنا ہی مفسد اور متفنی کیوں نہ ہو ڈاکٹر صاحب کو بدنام نہیں کرسکتا تھا، نہ عوام میں نہ خواص میں!

وہ ہم میں کسی سے علم میں کم نہ تھے، عمل میں سب سے ممتاز تھے، وہ ان علوم کے عالم باعمل تھے، جن سے ہم میں بہت کم لوگ آشنا ہیں، اور جن پر عمل کرنے والا شاید کوئی نہیں یعنی دین اور اخلاق کا علم! کبھی کبھی کچھ سطح کا بھی احساس ہونے لگتا ہے کہ کہیں ایسا تو نہیں کہ ڈاکٹر صاحب کی شخصیت میں علی گڑھ بالکل ایک نئے تجربے یعنی "مرد مومن" سے دوچار ہوا ہو!

مطبوعات جدیدہ

معارف الحدیث جلد دوم — مولفہ جناب محمد منظور صاحب نعمانی، تقطیع بڑی، ضخامت ۳۴۰ صفحات، کاغذ، کتابت و طباعت بہتر، قیمت مجلد صر غیر مجلد للعہ۔ پتہ: کتب خانہ الفرقان، کچہری روڈ، لکھنو۔

فاضل مولف نے اردو میں منتخب احادیث کی جمع و ترتیب اور ان کے ترجمہ و تشریح کا جو مفید سلسلہ شروع کیا ہے، یہ اس کا دوسرا حصہ ہے، پہلا عرصہ ہوا شائع ہوچکا ہے۔ ان دونوں حصوں میں ایسی حدیثیں جمع کی گئی ہیں جن کا تعلق عملی زندگی سے ہے اور جن سے دینی و روحانی تربیت، سیرت سازی اور صحیح اسلامی زندگی کی تعمیر میں ہدایت و رہنمائی حاصل ہوتی ہے، چنانچہ پہلے حصہ میں اس کی اساس و بنیاد، ایمان و آخرت سے متعلق، اور اس حصہ میں رقاق و اخلاق کی احادیث ہیں، کتاب الرقاق میں خوف خدا و فکر آخرت، دنیا کی تحقیر و مذمت، زہد و اس کے ثمرات و برکات، اور زہد نبوی اور کتاب الاخلاق میں اچھے برے اخلاق، سخاوت و بخل، احسان، ایثار اور اس کی حقیقت، انس و محبت اور بیگانگی و عداوت، دینی اخوت و اسلامی ہمدردی، نرم مزاجی اور درشت خوئی، خوش کلامی اور بدزبانی، صدق و امانت اور کذب و خیانت، ایفاے وعدہ و وعدہ خلافی، تواضع و خاکساری؛ و غرور و تکبر، شرم و حیا، قناعت و استغنا اور حرص و طمع، صبر و شکر، توکل اور رضا بالقضاء، اخلاص و للہیت اور نام و نمود وغیرہ کے عنوانات کے ماتحت ان سے متعلق حدیثیں جمع کی گئی ہیں، ہر عنوان کے شروع میں اسکی اہمیت

حقیقت واضح کی گئی ہے، اس کے بعد اس کے متعلق احادیث مع ترجمہ تحریر کی گئی ہیں، اور انکی دلنشین تشریح کی گئی ہے، مصنف دینی بصیرت کے ساتھ موجودہ زمانہ کے مذاق اور رجحانات سے بھی واقف ہیں، اس لیے احادیث کے انتخاب اور ان کی تشریح میں اس کا بھی لحاظ رکھا ہے، چنانچہ اگر کسی حدیث کے کسی پہلو پر کوئی شبہہ یا اعتراض وارد ہوتا ہے تو تشریح میں اس کو صاف کر دیا گیا ہے، مگر اس طرح کہ حدیث کی اصل روح میں کوئی فرق نہیں آنے پایا ہے، اردو میں حدیثوں کے جو مجموعے اب تک مرتب ہو چکے ہیں، یہ مجموعہ ان سب میں بہتر، مفید اور اس لایق ہے کہ مسلمان اس گنج گرانمایہ سے پورا فائدہ اٹھائیں۔

مقالات الشعراء ۔ میر علی شیر تتوی مرتبہ جناب پیر حسام الدین راشدی تقطیع اوسط،

ضخامت ۱۰۸ صفحات، کاغذ بہتر، خوبصورت ٹائپ میں چھپی ہے، قیمت تحریر نہیں،

سندھ کی سرزمین ایک زمانہ تک علم و فن اور علماء و فضلا کا مرکز رہ چکی ہے، اسکی خاک سے بڑے بڑے اصحاب کمال اٹھے جن کے علمی آثار اسلامی تاریخ کا قیمتی سرمایہ ہیں، مگر سندھ کی مرکزیت ختم ہونے کے بعد اس کی علمی تاریخ کی تدوین اور اس کے علمی آثار کے تحفظ اور انکی اشاعت کی طرف بہت کم توجہ کی گئی، جس سے بہت سے علمی آثار گوشۂ گمنامی میں پڑ گئے، قیام پاکستان کے بعد سندھ کے ادبی بورڈ نے ادھر توجہ کی ہے، اور وہ اس سلسلہ میں کئی اہم اور قدیم علمی و تاریخی کتابیں شائع کر چکا ہے، اب اس نے مقالات الشعراء شائع کی ہے، اس کے مصنف میر علی شیر قانع تتوی المتوفی ۱۲۰۳ھ سندھ کے نامور فضلا میں تھے، فارسی نظم و نثر خصوصاً نظم میں ان کی بہت سی یادگاریں ہیں، ان میں سب سے اہم مقالات الشعراء ہے، یہ سندھ کے فارسی شعرا کا مبسوط تذکرہ ہے جس میں (۹۱) شعراء کا مختصر حال اور ان کے کلام کا نمونہ دیا گیا ہے، یہ تذکرہ نایاب ہے، اس کا خود مصنف کے قلم کا لکھا ہوا ایک نادر نسخہ سندھ ادبی بورڈ کے پاس ہے، اور

مختلف مقامات پر اس کی چند نقلیں ہیں، پیر حسام الدین راشدی نے جو اپنی خاندانی علمی روایات کے حامل اور نہایت بلند علمی مذاق رکھتے ہیں، اس نایاب تذکرہ کو تصحیح و ترتیب کے پورے اہتمام کے ساتھ مرتب کیا ہے، اس کی تصحیح و مقابلہ میں مصنف کے قلم کے اصل نسخے اور اسکی نقلوں اور اسکی ترتیب و حواشی میں ۱۳۷ ماخذوں سے مدد لی گئی ہے، شعراء کے حالات میں جو تشریح طلب امور ہیں یا دوسرے ماخذوں سے ان کے متعلق جو مزید معلومات حاصل ہوتے ہیں، حاشیہ میں اسکی تشریح اور انکا اضافہ کیا گیا ہے جس سے اس تذکرہ کی افادیت اور بڑھ گئی ہے، کتاب کے شروع میں مرتب کے قلم سے فارسی میں مصنف تذکرہ کے حالات، انکی تصانیف کا مفصل تذکرہ اور مقالات الشعراء کے قلمی نسخوں کی تفصیل درج ہے، اور کتاب کے آخر میں ان ماخذوں کی فہرست ہے جن سے اس کی ترتیب میں مدد لی گئی ہے، اور آخر میں اسماء و اعلام کا انڈکس ہے، اس طرح یہ کتاب تصحیح و تحقیق اور ترتیب و تہذیب کے جملہ لوازم سے آراستہ ہے، اسکی اشاعت سے سندھ کی علمی تاریخ اور فارسی تذکروں میں ایک اہم تذکرہ کا اضافہ ہوا جس کے لیے فاضل مرتب اور سندھ ادبی بورڈ دونوں مبارکباد کے مستحق ہیں۔

تنقیدی شعور ۔ از جناب سید اختر علی صاحب تلہری تقطیع چھوٹی، ضخامت ۲۰۰ صفحات

کاغذ، کتابت و طباعت بہتر قیمت ۱۲ پتہ: کتاب نگر دین دیال روڈ لکھنؤ،

یہ کتاب لایق مصنف کے بارہ ادبی و تنقیدی مضامین کا مجموعہ ہے، جو مختلف رسالوں میں شائع ہو چکے ہیں، شعر اور ذوق سلیم، تخلیقی ادب اور تنقیدی ادب، ادب اور زندگی، شعر اور ترقی پسند ادب، شاعری کے نئے رجحانات، جناب مجنوں گورکھپوری کے تنقیدی مزعومات، نئے ادیبوں پر مداوا کا ردعمل، موجودہ ادیبوں اور شاعروں سے آزاد ہندوستان کا مطالبہ، پنڈت چکبست ایک انشاء پرداز کی حیثیت سے، صفی لکھنوی کی نظم نگاری صحیفۂ الملت کے آئینہ میں، حالی اور پیروی مغربی، اقبال اور اشتراکیت، جیسا کہ ان مضامین کے عنوانات سے ظاہر ہے

بیشتر مضامین ادب و شعر کے بارہ میں ترقی پسند اور نئے ادب اور اس کے ادیبوں کے خیالات و نظریات اور انکی ادبی و شعری حیثیت پر تنقید و اصلاح سے متعلق ہیں، فاضل مصنف صاحب فکر و نظر ادیبوں میں ہیں، وہ محض نقال نہیں، بلکہ ادبیات کے متعلق اپنا مستقل نقطۂ نظر رکھتے ہیں، ان میں جدت و قدامت کا نہایت معتدل امتزاج ہے، وہ اپنے پرانے ادبی سرمایہ کو بھی قابل قدر سمجھتے ہیں اور نئے ادبی تقاضوں سے بھی غافل نہیں، اور ان دونوں کے صالح عناصر کے لیے ان کا دل کشادہ اور دامن وسیع ہے، اسی نقطۂ نظر سے انھوں نے ترقی پسند ادب اور اس کے ادیبوں کے افکار و تصورات اور ان کے ادبی ذخیرہ کا جائزہ لیا ہے، ان پر تنقید کی ہے اور اس بارہ میں اپنے خیالات پیش کیے ہیں، یہ مضامین فکری اور ادبی دونوں حیثیتوں سے نہایت سنجیدہ، متوازن اور منصفانہ ہیں، جن سے ادبیات میں صحیح رہنمائی حاصل ہوتی ہے مگر اب خود ترقی پسند ادیبوں کو اپنی بہت سی غلطیوں کا احساس ہو گیا ہے، اور کسی حد تک انھوں نے اسکی اصلاح بھی کر لی ہے چنانچہ ترقی پسند ادیبوں کا سنجیدہ اور صاحب نظر طبقہ نام نہاد ترقی پسند ادیبوں کی جدتوں اور بدعتوں کو پسند نہیں کرتا، پھر بھی اس کی بنیادی خرابی یعنی اس کے اشتراکی لٹریچر کی نقالی اور اندھی تقلید بڑی حد تک اب بھی قائم ہے، جو ناقابل اصلاح ہے، اس لیے کہ اس تحریک کی بنیاد ہی اسی پر ہے، پھر بھی اس میں متانت و سنجیدگی آگئی ہے، بہرحال مصنف کے یہ سب مضامین فکری اور ادبی دونوں حیثیتوں سے ترقی پسند ادیبوں کے مطالعہ اور استفادہ کے لائق ہیں،

"م"

نمبر۲ ماہ محرم الحرام ۱۳۷۸ھ مطابق ماہ اگست ۱۹۵۸ء جلد ۸۲

مضامین